طبع نے اسکو مقدم رکھا . . . " (ص ۶۲، ۶۳) مصنف تحریر کرتے ہیں "یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ اکبر نے بھی ۱۰۰۲ھ مطابق ۱۵۹۳ء میں اصرار کے ساتھ کہا کہ خمسہ کو پورا ہونا چاہئے، فیضی نے دوسری مثنویوں کی بھی بنیاد ڈالی، اور سب کے کچھ نہ کچھ شعر کہے، لیکن چونکہ بہت سے مشغلے پیش آتے رہتے تھے، اس لیے سوائے دو کے اور کوئی مثنوی انجام کو نہ پہنچی" (ص ۵) اس سے دھوکہ ہوتا ہے کہ اکبر کے اصرار کے بعد ہی فیضی نے مثنویوں کی بنیاد ڈالی تھی، اور اس اثنا میں اور مشغلے پیش آنے کی وجہ سے یہ کام موقوف ہوتا رہا، حالانکہ اکبر کے اصرار سے پہلے ہی وہ خمسہ شروع کر چکا تھا، لیکن مشاغل پیش آنے کی وجہ سے درمیان میں اس کا سلسلہ موقوف کر دینا پڑتا تھا، مگر اکبر کے اصرار کے بعد وہ اس کی تکمیل میں مشغول ہوگیا، یہ الگ بات ہے کہ اسکے باوجود وہ خمسہ کی سب مثنویوں کو مکمل نہیں کر سکا، علاوہ ازیں مولانا شبلی کی خط کشیدہ عبارت حذف کرنے سے مصنف کی عبارت میں یہ التباس بھی پیدا ہوگیا ہے کہ دوسری مثنویاں خمسہ کے علاوہ تھیں، تحریر اور طرز ادا میں ناہمواری کی وجہ سے بعض عبارتیں بڑی گنجلک ہوگئی ہیں اور کہیں کہیں مصنف کے الفاظ سے انکا مدعا واضح نہیں ہو سکا ہے جیسے وہ لکھتے ہیں،

"اور اس امر کو بھی ملحوظ رکھا ہے کہ شعرا کے متعلق معلومات اسی حد تک تجسس طلب ہوں جس حد تک وہ انکے علم و فن پر اثر انداز ہوتے ہیں" ص ۲ "بلکہ دنیائے ادب کے سدا بہار باغ کی قفل کشائی کر کے اہل نظر کو گلستان فارسی کی سیر پر مائل و آمادہ بھی کر سکا" ص ۲ "اسکی (کتبخانہ کی) توسیع و اشاعت میں ہر ممکن حربہ استعمال کرتے تھے، احباب اور دوستوں سے کتابوں کی فراہمی کے سلسلہ میں بڑے ادب اور انکساری سے لکھتے تھے" (ص ۱۵) "جب فیضی بیمار ہوئے تو عرفی عیادت کو گئے، فیضی اسوقت ایک پلے سے کھیل رہے تھے، عرفی نے معلوم کیا "اسم مخدوم زادہ چیست" فیضی نے جواب میں کہا . . . " (ص ۳۵) اور اپنی طرف سے انکسار و مناسبت کے ساتھ معذرت کرتی (اداکردیا ص ۹۰) "اجمالاً غالب کا کلام شعر و ادب کا سدا بہار باغ بھی ہے" اور غور و فکر کی بلکنت ضیافت بھی (ص ۵۰۷) نے "ان" "اگرچہ" اور "اگر" وغیرہ جن جملوں میں استعمال ہوئے ہیں وہ صحیح نہیں ہیں، مرآۃ العالم کو مرآۃ العلم، سواطع الالہام کو سواطع الالہام اور موارد الکلم کو موارد الکلام لکھا ہے، ایک جگہ غیظ کا املا غیض تحریر کیا گیا ہے، زبان و بیان کی ہر قسم کی غلطیوں سے اندازہ ہوتا ہے کہ غالباً نظر ثانی کے بغیر ہی کتاب شائع کر دی گئی ہے، اردو اور فارسی کے استادوں کی جانب سے تحریر و تصنیف میں اسطرح کی بے احتیاطی بالکل ہی مناسب نہیں۔ "ض"

جلد ۱۱۶ - ماہ اگست ۱۹۷۵ء مطابق ماہ شعبان المعظم ۱۳۹۵ھ عدد ۲

مضامین

شذرات

اب سے پچاسی سال پہلے علامہ شبلی نعمانیؒ نے یہ آواز بلند کی تھی کہ ہندوستان میں یک ایسا مثالی دینی مدرسہ ہو جو اپنی جامعیت و عظمت کے لحاظ سے مدرسۂ اعظم کہلانے کا مستحق ہو، جس میں دینی علوم کی تعلیم ایسی ہو کہ یہاں کے فارغ شدہ طلبہ، اسلام کے مخالفوں کے اعتراضات کا جواب زمانہ کے مذاق کے مطابق دے سکیں۔

مولانا محمد علی مونگیریؒ کی بھی آرزو تھی کہ ایک ایسا مدرسہ قائم کیا جائے جس سے ایسی جماعت پیدا ہو جو اپنی واقفیت و اطلاع، انتظام و تدبیر اور حزم و مصلحت اندیشی میں قرن اولیٰ کے بزرگان دین کی یاد تازہ کر سکے، ان دونوں بزرگوں نے جو خواب دیکھا تھا، اسکی تعبیر اس وقت پوری ہوئی جب ۱۳۱۶ھ مطابق ۱۸۹۶ء میں لکھنؤ میں دارالعلوم ندوۃ العلماء قائم ہوا، جو ایک دینی تعلیمی اور علمی تحریک بھی بن گیا، اس کے ذریعہ سے دینی مدارس کے نصاب میں ایسی اصلاحات کی گئیں کہ رفتہ رفتہ یہ جدید و قدیم گروہ کا ایک سنگم بن گیا، اس درسگاہ میں اطوار و افکار کی جو روشن ضمیری اور رعنائی ملی اس سے مرصع اور مسلح ہو کر کچھ ایسے علماء و فضلاء پیدا ہوئے، جنھوں نے اسلام اور اسلامی علوم کی بڑی قابل قدر خدمت انجام دی۔

ان میں سب سے نمایاں نام استاذی المحترم مولانا سید سلیمان ندویؒ کا ہے، جو اپنی علمی عظمت و فضیلت کی وجہ سے فخر ملت اسلامیہ بن گئے، ان کے قلم سے چراغ مصطفوی

کی تابناک ضیا جس طرح پھیلی اس سے ندوۃ العلماء کی دعوت و تحریک کو بڑی تقویت پہونچی، وہ دارالعلوم ندوۃ العلماء کو اپنی زندگی کا شہ رگ سمجھتے رہے، اس سے وابستہ رہ کر اپنے زمانہ کے لحاظ سے اسکو فروغ دینے میں ہر ممکن کوشش کی، دارالعلوم ندوہ کو ان پر فخر ہے، تو خود ان کو اپنی اس مادر درسگاہ پر ناز رہا۔

ان ہی کے لایق شاگرد مولانا ابوالحسن علی ندوی ہیں، جو اس وقت ندوۃ العلماء کی روح رواں بن کر اس کی دعوت و تحریک کو آگے بڑھانے بلکہ بعض حیثیتوں سے ان سے بہت آگے جا چکے ہیں، جب دارالعلوم ندوۃ العلماء قائم ہو رہا تھا تو علامہ شبلی نعمانیؒ کی یہ تمنا ہوئی کہ اسکی عمارت وسیع، پر فضا، اور عظیم الشان ہو، مولانا ابوالحسن علی ندوی کے دور نظامت میں اس کے ہر گوشہ میں علامہ شبلی نعمانی کی تمنا پوری ہوتی، دکھائی دیتی ہے، اس کے احاطہ میں داخل ہو کر یہ محسوس ہوتا ہے کہ ہم ایک ایسی درسگاہ میں کھڑے ہیں جو دنیا کی ممتاز درسگاہوں میں شمار کی جا سکتی ہے، ان ہی کی کاوشوں سے یہ درسگاہ ایک علمی مرکز بھی بن گئی ہے، یہاں سے اردو، عربی، انگریزی میں ایسی باوزن، اور مفید کتابیں شایع ہو رہی ہیں، جو اسلام کے ذہنی، فکری، اور تبلیغی لٹریچر کا بہت ہی قیمتی سرمایہ بن رہا ہے،

مولانا ابوالحسن علی ندوی اس وقت اسلامی علوم و فنون کے شاہین بنے ہوئے ہیں، اسی کے ساتھ علم و فن کے شاہین بچوں کو بال و پر دینے کا بھی بڑا ملکہ رکھتے ہیں

ان ہی کی نگرانی میں ۳۱ر اکتوبر سے ۲ر نومبر ۱۹۷۵ء تک دارالعلوم ندوۃ العلماء کا ۸۵ سالہ جشن تعلیمی منایا جا رہا ہے، جس میں اندرون ملک کے علاوہ اسلام کے اہل فکر و نظر کو بھی مدعو کیا گیا ہے، یہ معلوم کر کے خوشی ہے۔ کہ سعودی عربیہ، مصر، الجزائر، ٹیونس، لیبیا، اور شام کی حکومتوں نے اس میں شرکت کرنے کے لئے اپنے سرکاری وفود بھیجنے کا

پورا ادعدہ کیا ہے، اس سے اسلامی ممالک میں دارالعلوم ندوۃ العلماء کی شہرت اور مقبولیت کا بھی اندازہ ہوتا ہے، جس میں بلاشبہ روز افزوں اضافہ مولانا ابوالحسن علی ندوی کی ذات گرامی کی وجہ سے ہو رہا ہے، انھوں نے ہندوستانی مسلمانوں کے ضمیر اور سفیر بن کر اس دینی اور تعلیمی ادارہ کے تعلقات کو اسلامی ممالک سے جس طرح استوار کیا ہے، وہ اس کی تاریخ کا بڑا زرین کارنامہ شمار کیا جائے گا۔ اس شاندار اجتماع میں اسلامی ممالک کے نمایندوں کو یہ مطالعہ کرنے کا موقع ملے گا کہ نہ صرف اس ملک بلکہ عالم اسلام کے مذہبی، علمی اور تہذیبی دور میں ندوۃ العلماء کا کیا حصہ رہا ہے، اس سے اسلامی ممالک میں ہمارے وطن کی عظمت بھی بڑھے گی، امید ہے کہ حکومت ہند بھی اس بین الاقوامی اجتماع کو قدر کی نگاہ سے دیکھے گی، کیونکہ اس سے ہمارے ملک اور اسلامی ممالک کے درمیان خوشگوار ثقافتی علمی اور تعلیمی تعلقات بھی پیدا ہونے کی توقع ہے، جس کی ضرورت اس وقت بہت محسوس کی جارہی ہے۔

دعا ہے کہ یہ اجتماع ہر لحاظ سے کامیاب ہو، ندوۃ العلماء کی دعوت و تحریک صحیح معنوں میں قدیم و جدید اور عقل و نقل کا قابل قدر امتزاج ہو، دارالمصنفین بھی ندوۃ العلماء کی دعوت و تحریک کی ایک زرین کڑی ہے، اس کی طرف سے اس کے وارثوں اور حامیوں کے لئے، اس جشن کے موقع پر یہ پیام ہے،

تیرے سینے میں ہے پوشیدہ رازِ زندگی کہہ دے
مسلماں سے حدیثِ سوز و سازِ زندگی کہہ دے

مقالات

مولانا حیدر حسن خاں ٹونکی

(از مولانا عبد السّلام قدوائی ندوی)

(۳)

عموماً اس روایت سے عورتوں کی امارت اور سرداری کا عدم جواز ثابت کیا جاتا ہے لیکن اس وقت مولوی صاحب کو اس مسئلہ سے کوئی بحث نہیں تھی، ان کی ادب شناس نگاہ کو اس میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی تنقیص نظر آئی، اور فرمایا دیکھو تو راوی کس طرح ام المومنین صدیقہ طاہرہ پر طنز کر رہا ہے کوئی اور ہوتا تو بخاری کی جلالت شان سے مرعوب ہو جاتا مگر وہ جانتے تھے کہ معصوم صرف انبیاء علیہم السّلام ہوتے ہیں ان کے علاوہ کوئی کتنا ہی بڑا شخص ہو معصوم عن الخطا نہیں ہے اس سے غلطی ہو سکتی ہے، ان کی نظر میں حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کی عزت و حرمت راوی سے کہا زیادہ تھی، اسماء الرجال کی کتابیں پاس ہی رکھی ہوئی تھیں، میزان الاعتدال اور تہذیب اٹھا کر دیں، اور فرمایا راویوں کی سرگزشت پڑھو کتاب کھولتے ہیں تو عثمان بن ہشیم کے متعلق ملتا ہے ٹھیک ٹھاک نہیں ہے، غلطی بہت کرتا ہے آخر میں اسکا یہ حال تھا کہ جو تلقین کر دی جاتی اسے قبول کر لیتا تھا دوسرے راوی عوف کے متعلق اس میں بھی بڑھ کر لکھا تھا، قدری اور شیعی تھا، شیعیت کا اظہار کرتا تھا، داود بن ہند اسے مارتے تھے، اور کہتے تھے، قدری! تیری ہلاکت ہو ایک اور امام جرح و تعدیل بندار کا بیان ہے، "کان قدریا رافضیا شیطانا" انھوں نے قدریت (اعتزال) اور رفض کے الزام کے علاوہ اسے شیطان بھی قرار دیا، ائمہ جرح

وتعدیل نے یہ بھی کہا ہے کہ یہ حضرت حسن بصریؒ سے ایسی باتوں کی روایت کرتا تھا، جو اور کوئی نہیں بیان کرتا تھا۔

اسماء الرجال کی کتابوں میں راویوں کا اعمال نامہ پڑھا جا چکا تو فرمایا کہ اس جرح مبین (واضح اعتراض) کے بعد کسی کے محض ثقہ اور صدوق کہنے سے راوی کی صفائی نہیں ہو سکتی ہے، یہ عقیدۃً حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا مخالف ہے اس لیے اس کی کوئی ایسی روایت قابل قبول نہیں ہو سکتی، جس سے ان کی تنقیص ہوتی ہو، اس خیال کے ثبوت میں اصول حدیث کی کتابوں کی عبارتیں بھی دکھادیں۔

مولوی صاحب کے فیض صحبت سے ان کے شاگردوں میں بھی اس طرز کی بصیرت پیدا ہو گئی تھی، ایک مرتبہ سنن ابی داؤد کی کتاب الاشربہ کی اس روایت پر نظر پڑی کہ

"تحریم خمر سے پہلے ایک مرتبہ ایک انصاری نے حضرت علیؓ اور حضرت عبدالرحمٰن بن عوفؓ کی دعوت کی اور انھیں شراب پلائی اس کے بعد حضرت علیؓ نے نماز پڑھائی اور نشہ کی وجہ سے قل یا ایہا الکافرون میں کچھ کا کچھ پڑھ گئے، اس کے بعد لا تقربوا الصلوٰۃ وانتم سکاریٰ کی آیت نازل ہوئی"

اس روایت کو پڑھ کر ہمارے دوست مولانا مسعود عالم ندوی مرحوم کے دل میں فوراً کھٹک پیدا ہوئی، اس وقت وہ مولوی صاحب سے حدیث کی اونچی کتابیں پڑھتے تھے، ابوداؤد کی اس روایت کو پڑھتے ہی انھوں نے کہا ارے یہ کیسے ہو سکتا ہے، حضرت علیؓ تو شروع ہی سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ رہتے تھے، نو برس کی عمر میں وہ اسلام لے آئے تھے، جو شخص بچپن سے آپ کی تربیت میں رہا ہو وہ شراب کے پاس بھی نہیں جا سکتا، بس پھر کیا تھا، تحقیق شروع ہو گئی، حاکم نے مستدرک میں اس حدیث کے مختلف سلسلے

نقل کیے ہیں، اور جس روایت میں حضرت علیؓ کے بارے میں شراب کا ذکر ہے اس کے مقابلہ میں ان روایتوں کو ترجیح دی ہے جن میں حضرت علیؓ کا ذکر نہیں ہے، لیکن راوی پر جرح نہیں کی ہے، بلکہ وجہ ترجیح یہ بیان کی ہے کہ عطاء بن سائب سے ان روایتوں کو سفیان ثوری نے روایت کیا ہے، اور عطاء کے شاگردوں میں سفیان زیادہ قوی اور قابل اعتماد ہیں، لیکن اس سے بات کس طرح بن سکتی تھی، سفیان کے ذریعہ سے بعض روایات ایسی بھی ہیں جن میں حضرت علیؓ کے بارہ میں شراب اور نشہ کا ذکر ہے، خود ابوداؤد کی مذکورۂ بالا روایت عطاء سے سفیان ہی روایت کر رہے ہیں، اصل میں غلطی ابوعبدالرحمٰن سلمی کی ہے، لیکن بخاری کے راوی اور تابعی کے بارہ میں کون زبان کھولے، لیکن مولوی صاحب کی تعلیم تھی کہ حقیقت تک پہونچنے کی کوشش کرو اور اس راہ میں اشخاص سے مرعوب نہ ہو، حضرت علیؓ السابقون الاولون میں سے ہیں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے خاص تربیت یافتہ اور خلیفۂ راشد ہیں، ان کی ذات اس تہمت سے بری ہے، ابوعبدالرحمٰن مجروح ہوتا ہے تو ہو، حضرت علیؓ کی ذات پاک پر کیوں حرف آئے، بات یہ ہے کہ حضرت عثمانؓ کی شہادت کے بعد جو فتنے برپا ہوئے، اور حضرت علیؓ جن مشکلات سے دوچار ہوئے ان میں بہت سے لوگوں کو صراط مستقیم پر قائم رہنا دشوار ہو گیا، ابوعبدالرحمٰن سلمی بھی اس فتنہ کا شکار ہو گیا، وہ حضرت علیؓ کا مخالف ہو گیا، اور ان کی ذات کو ہدف ملامت بنانے لگا، اسماء الرجال کی کتابوں میں اسے عثمانی یعنی حضرت عثمانؓ کا طرفدار لکھا گیا ہے، مگر دراصل وہ حضرت علیؓ کا شدید مخالف ہو گیا تھا، خود بخاری کی کتاب الجہاد میں ان کے متعلق اس کا ایک بیان موجود ہے، جس کے بعد اس کی مخالفت وعناد کے ثبوت کے لئے اور کسی شہادت کی ضرورت نہیں، حاطب بن ابی بلتعہؓ ایک بدری صحابی ہیں، فتح مکہ سے پہلے انھوں نے قریش کو رسول اللہ

صلی اللہ علیہ وسلم کے ارادہ کی اطلاع دے دی تھی، یہ آپ کی مرضی کے خلاف تھا، آپ نے حضرت علیؓ کو دو ایک آدمیوں کے ساتھ بھیجا کہ قاصد سے خط چھین لائیں وہ گئے، ایک عورت ملی، مگر اس نے انکار کیا، جب انھوں نے سختی کی تو اس کے پاس سے خط برآمد ہوگیا، یہ خط جب مدینہ آیا تو آپؐ نے حاطب کو بلا کر پوچھا انھوں نے عذر پیش کیا حضرت عمرؓ کو بہت غصہ آیا اور انھوں نے کہا کہ حضرت اجازت دیجے تو میں اس کی گردن اڑا دوں، لیکن آپؐ نے فرمایا نہیں، یہ بدری ہیں، اللہ نے ان کے گناہ معاف کر دئے ہیں اور کہہ دیا ہے کہ اعملوا ما شئتم (جو چاہو کرو)

ابو عبد الرحمن اس روایت کو حضرت علیؓ کے ایک معتقد سے بیان کرتا ہے، اور کہتا ہے کہ حضرت علیؓ کے عہد خلافت میں جو خوں ریزی ہوئی اس کا سبب یہی "جو چاہو کرو" ہے، اس کے الفاظ پڑھئے کتنا سخت طنز کر رہا ہے، علوی کو مخاطب کرکے کہتا ہے

انی لاعلم ما الذی جراء	میں خوب جانتا ہوں کے تمھارے صاحب
صاحبک علی الدماء[1]	(علیؓ) کو کس چیز نے خوں ریزی کی جرأت دلائی ہے۔

پھر پوری روایت بیان کرنے کے بعد ایک بار پھر اسی بات کا اعادہ کرتا ہے اور کہتا ہے

فھذا الذی جراءہ	پس یہی وہ بات ہے جس نے ان کو جرأت دلائی ہے،

اس دل خراش طنز کو نقل کرتے ہوئے امام بخاری سے ضبط نہ ہو سکا اور لکھ دیا

---

[1] صحیح بخاری کتاب الجہاد باب اذا اضطر الرجل الی النظر فی شعور اہل الذمہ والمومنات اذا عصین اللہ و تجرید من،

وکان عثمانیا، ظاہر ہے کہ ایسے مخالف کی روایت حضرت علی کے خلاف قابل قبول نہیں ہو سکتی ہے، مولوی صاحب کے محققانہ درس نے تنقید و تحقیق کا جو ذوق پیدا کر دیا تھا اسکی اور بھی مثالیں نقل کی جا سکتی ہیں، مگر مضمون بہت طویل ہو جائے گا، اس لئے نظر انداز کی جا رہی ہیں،

مولوی صاحب عربی کے ادیب اور لغوی نہیں تھے، لیکن بعض اوقات مسائل کی تحقیق کے سلسلہ میں قرآن و حدیث کے ایسے الفاظ آجاتے تھے جن کا مفہوم متعین کرنے میں اہل زبان مختلف الخیال ہیں، ایسے مواقع پر علماء معانی و بیان اور ائمہ لغت کی اہم تصانیف کھلتیں، کلام عرب سے استشہاد ہوتا، اور الفاظ کی حقیقت اور مختلف زمانوں میں ان کے استعمال کی تاریخ پر نظر ڈالی جاتی اور بڑی کد و کاوش کے بعد رائے قائم کی جاتی۔

مولوی صاحب کے درس میں حنفی، شافعی، اہل حدیث سبھی نقطۂ نظر کے طالب علم ہوتے تھے، ہر ایک کو بحث کی پوری آزادی ہوتی تھی، مولوی صاحب تاکید کرتے تھے کہ محض میری بات نہ مانو بلکہ دلائل کو سمجھ کر رائے قائم کرو، اس طرز عمل کا اثر یہ تھا کہ ان کے شاگرد کسی بڑے سے بڑے آدمی کی تقلید پر قناعت نہیں کرتے تھے، حنفی مسلک سے تعلق رکھنے والے طلبہ بھی ان کی مجلس درس میں شریک ہو کر تقلیدی طور پر حنفی ہونے کے بجائے تحقیقی طور پر حنفیت اختیار کرتے تھے، وہ ہاں میں ہاں ملانے والوں کے بجائے ان طالب علموں کی زیادہ قدر کرتے تھے جو غور و خوض اور بحث و تحقیق کے عادی تھے، سطحی نظر رکھنے والے ان کی بلندی تحقیق سے گھبراتے تھے، اور سمجھتے تھے کہ اس سے اکابر کے متعلق بدظنی پیدا ہو جائے گی، لیکن یہ خیال صحیح نہیں تھا، ان کے انتہائی عقیدت مند شاگردوں پر بھی کبھی یہ اثر نہیں ہوا، بزرگوں کی تعظیم اسلاف کا احترام محدثین کی عزت اور فقہاء کا ادب ہمیشہ ملحوظ رہا البتہ اکابر پرستی کی طرف کبھی میلان

نہیں ہوا، اور دل میں یہ خیال جم گیا کہ اصاغر ہوں یا اکابر، متاخرین ہوں یا متقدمین عزت سب کی کرنا چاہئے، لیکن تقلید کے بجائے نظر ہمیشہ دلائل پر رہنا چاہئے، مولوی صاحب کہتے تھے کہ تعظیم وتکریم اپنی جگہ پر ہے اور بحث وتحقیق اپنی جگہ پر، دلیل کی راہ میں عقیدت کو حائل نہیں ہونا چاہئے، باپ ہو یا استاد، مرشد ہو یا محسن ان کا احترام سرآنکھوں پر لیکن ان کی باتوں کو سمجھنا، اور ان کے دلائل پر غور کرنا ایک طالب حق کے لئے ضروری ہے،

مدرسین کے تقرر میں بھی وہ اس کا لحاظ رکھتے تھے، ان کے یہاں مدرسین کے لیے علمی استعداد ضروری تھی، اگر انتخاب کے موقع پر کوئی کہتا کہ فلاں بڑا دین دار ہے تو فرماتے دین دار تو سب کو ہونا ہی چاہئے، مگر دینداری کے ساتھ علمی کمال بھی ضروری ہے، اگر اس میں خامی ہے تو مدرسہ میں اس کی جگہ نہیں ہے،

عارضی انقطاع اوپر گزر چکا ہے کہ ناظم ندوۃ العلماء حکیم سید عبدالحئی صاحب کی جوہر شناس نگاہ نے مولانا حیدر حسن خان کو پہچانا اور ان کی قدردانی انھیں یہاں لائی جب تک حکیم صاحب زندہ رہے، انھیں برابر ان کی دلجوئی کا خیال رہا، مولوی صاحب بھی ان سے بہت مانوس تھے، اور وقتاً فوقتاً ان سے ملتے رہتے تھے، ۳ فروری ۱۹۲۳ء کو اچانک ان کا انتقال ہوگیا، اس کے بعد ندوہ سے ان کی طبیعت میں وہ انبساط باقی نہ رہا، مگر پھر بھی ندوہ کی خدمت میں لگے رہے، ۱۹۲۶ء میں حسب معمول تعطیل کے زمانہ میں اپنے وطن ٹونک گئے، وہاں چھٹی کے آخری دنوں میں صاحبزادہ سعید حسن خان بیمار ہوگئے، مولوی صاحب نے رخصت کی درخواست بھیجی ندوہ میں قاعدہ تھا کہ تعطیل کلاں سے متصل چھٹی نہیں دی جاتی تھی، ناظم صاحب کو بیماری کی اہمیت کا پورا اندازہ نہیں ہوا، اور انھوں نے رخصت منظور نہیں کی، نامنظوری کی اطلاع پہونچی تو صاحبزادہ کی حالت نازک تھی، مولوی صاحب کو

یہ بات بہت ناگوار ہوئی، اور انھوں نے استعفا بھیج دیا، سعید میاں کا اس بیماری میں انتقال ہوگیا، مولوی صاحب کو بے حد صدمہ ہوا جوان وسعادت مند بیٹے کی موت زندگی بھر نہیں بھولی جب کبھی ذکر آجاتا تو آنکھیں اشکبار ہوجاتیں۔

تقریباً دو سال وہ ٹونک میں رہے، اس اثنا میں وہاں قرأت کے ایک مدرسہ کی بنیاد ڈالی، انھیں فن قرأت سے بڑا شغف تھا، تجوید کی باقاعدہ تعلیم حاصل کی تھی، اور اس فن کی اونچی کتابیں ان کی نظر سے گزر چکی تھیں، وہ بڑے پر اثر لہجہ میں قرآن مجید پڑھتے تھے، ان کی تلاوت میں جو قرآن مجید رہتا تھا، اس میں حفص کی قرأت کے علاوہ دوسری قراءتیں بھی مختلف روشنائی سے درج تھیں، تاکہ ایک نظر میں ساری قرأتیں سامنے آجائیں وہ چاہتے تھے کہ علماء اس جانب متوجہ ہوں کم علم قاریوں سے مطمئن نہ تھے، تجوید کی جانب ان کی توجہ میں مولانا عین القضاۃ[۱] کے مدرسہ فرقانیہ کی وجہ سے اور اضافہ ہوا، وہاں کے

---

[۱] مولانا عین القضاۃ بہت بڑے عالم اور صاحب کمال درویش تھے، ان کے والد سید محمد وزیر حیدرآباد میں رہتے تھے وہیں ۱۲۷۴ھ (۱۸۵۸ء) میں مولانا عین القضاۃ پیدا ہوئے سلسلہ نسب حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی کے واسطہ سے امام حسن تک پہونچتا تھا، ابتدائی تعلیم حیدر آباد میں حاصل کی، پھر لکھنؤ آکر مولانا عبدالحئی فرنگی محلی کے حلقۂ درس میں شامل ہوئے، فراغت کے بعد کچھ عرصہ درس دیتے رہے، پھر تصوف کی طرف میلان ہوا، اور حاجی موسیٰ ترکیسری سے سلسلۂ مجددیہ نقشبندیہ میں بیعت کی جو ایک واسطہ سے شاہ غلام علی کے خلیفہ تھے، کچھ عرصہ تک مرشد کی خدمت میں رہ کر خلافت حاصل کی، پھر لکھنؤ آکر استاد کے دولت کدہ پر درس دینے لگے، اس کے بعد والد صاحب کے ہمراہ حج کے لیے تشریف لے گئے، اور دو سال حرمین شریفین میں قیام کرکے وہاں کے فیوض وبرکات سے مستفید ہوئے، وہاں سے واپس آکر لکھنؤ میں تدریس

قاریوں میں وہ قاری عبدالمالک کو بہت پسند کرتے تھے، ان کی خواہش تھی کہ قاری صاحب ٹونک کے مدرسہ فرقانیہ کی خدمت قبول کرلیں مگر مولانا عین القضاۃ کی زندگی بھر تو قاری عبدالمالک صاحب کہیں اور جانے پر آمادہ نہ ہوئے، لیکن مولانا کی وفات کے بعد مولوی صاحب کے اصرار کی وجہ سے وہ اس پر آمادہ ہوگئے، اور کئی برس تک ٹونک میں رہے،

(بقیہ حاشیہ ص ۹۱) اور تزکیہ نفس کے شغل میں مصروف ہوگئے، ۱۳۲۶ھ (۱۹۰۹ء) میں دوبارہ حج و زیارت سے مشرف ہوئے، واپس آکر ان کے والد نے قرآن مجید کی تعلیم اور حفظ و قرارت کے لیے ایک مدرسہ کی بنیاد رکھی، جس نے آگے چل کر مدرسہ فرقانیہ کے نام سے بڑی شہرت حاصل کی ۱۳۳۱ھ (۱۹۱۳ء) میں والد صاحب کے انتقال کے بعد مدرسہ کی ساری ذمہ داری مولانا عین القضاۃ کے سر پر آگئی، مولانا نے اس کو بہت ترقی دی، ایک عالی شان عمارت تعمیر کرائی، اور چوٹی کے علماء، قراء اور حفاظ کا تقرر کیا، مولانا کے آخری دور میں کبھی کبھی مدرسہ فرقانیہ آنا جانا ہوتا، اس زمانہ میں چھوٹے بڑے ۲۴ مدرس اور ساڑھے سات سو طالب علم تھے، جنھیں مدرسہ سے روزانہ دونوں وقت کھانا، اور دو روپیہ ماہوار جیب خرچ ملتا تھا، کپڑے اور جوتے بھی دیے جاتے تھے، اس زمانہ میں جب کہ ہر چیز ارزاں تھی، مدرسہ کا خرچ تقریباً ایک لاکھ سالانہ تھا، سال میں دو بار مولانا اعلیٰ پیمانہ پر سارے شہر کی دعوت کرتے تھے، ثقہ راویوں کا بیان ہے کہ ہر دعوت میں عمدہ قسم کے دو سو دنبے ذبح ہوتے تھے، حضرت مجدد صاحب سے بڑی عقیدت تھی، ان کے عرس کے موقع پر سیکڑوں حفاظ اور قراء سرہند بھیجتے تھے، جو وہاں کافی دنوں قیام کرتے اور تلاوت کرکے مجدد صاحب کی روح کو ایصال ثواب کرتے تھے، ان لوگوں کے قیام و طعام اور سفر کے مصارف پر بے دریغ رقم صرف کرتے تھے،

ان مصارف کے علاوہ روزانہ داد و دہش کا سلسلہ بھی جاری رہتا تھا، بہت سے لوگوں کے

ندوہ میں دوبارہ آمد

مولانا کے جانے کے بعد ندوہ میں شیخ الحدیث کی جگہ خالی ہوگئی تقریباً دو سال اس خلا کو پر کرنے کی کوشش ہوتی رہی، لیکن ناظم اور معتمد دار العلوم کی جد و جہد کے باوجود کوئی شخص ایسا نہ مل سکا جو حدیث شریف کی اس خالی مسند کو پر کرسکتا آخر ہیر پھیر کر مولانا ہی پر نظریں پڑنے لگیں، ۱۳۴۶ھ (۱۹۲۸ء) میں شاید مارچ یا اپریل کا مہینہ تھا، وہ قاری عبدالمالک کو لینے لکھنؤ آئے قاری صاحب ٹونک کے مدرسہ قرات کے

(بقیہ حاشیہ ص ۹۲) ماہوار وظیفے مقرر تھے، عصر کے بعد حجرہ کے دروازے کھل جاتے اور مغرب تک ملاقات کرنے والوں کے لیے اذن عام ہوتا، اس موقع پر اہل حاجت بھی حاضر ہوتے مولانا حیدر حسن خان مولانا سے بڑا تعلق رکھتے تھے، اکثر ان سے ملنے جاتے بعض حاجت مند ان کے ذریعہ اپنی ضرورت بیان کرتے ایک مرتبہ مولوی صاحب نے ان سے کہا کہ میری وجہ سے آپ کو زحمت ہوتی ہے، لیکن کیا کروں صاحبان حاجت اس طرح پیچھے پڑتے ہیں کہ سفارش کے لیے مجبور ہوجاتا ہوں یہ سن کر مولانا عین القضاۃ نے فرمایا، مولوی صاحب میں تو گوشہ نشین ہوں مجھے کیا خبر کہ کون کس حال میں ہے، یہ تو آپ کی مہربانی ہے کہ لوگوں کو میرے پاس پہونچاتے ہیں، اور مجھے ان کی خدمت کا موقع دیتے ہیں، بعض اوقات لوگ جھوٹے حیلے بہانوں سے کام لیتے، مولانا حقیقت سمجھتے تھے، لیکن ذرا سا اشارہ بھی نہیں کرتے تھے، جس سے ظاہر ہو کہ یہ آدمی غلط بیانی سے کام لے رہا ہے، مولوی صاحب کا بیان ہے کہ ایک مرتبہ میں مولانا کی خدمت میں پہونچا تو فرمایا، مولوی صاحب آپ خوب آگئے، سنیے، ان صاحب کی شیر سے کیسی لڑائی ہوئی، ہاں بھائی سناؤ اب اس شخص نے کہنا شروع کیا، میں خالی ہاتھ ایک جنگل سے گزر رہا تھا، اچانک ایک شیر نکل آیا اور مجھ پر حملہ کردیا، مرتا کیا نہ کرتا میں نے بھی کمر ہمت باندھی اور اس سے بھڑ گیا کچھ دیر کی کشمکش کے بعد میں نے اسے مار ڈالا، مگر اس دھرنگ میں میرے گلے میں اس کے پنجے گڑ گئے اور میں زخمی ہوگیا، مولوی صاحب کہتے تھے کہ مجھے اس کے جھوٹ پر

ممتحن تھے، خبر ملی کہ مولوی صاحب آئے ہیں اور شیخ خلیل عرب کے یہاں ٹھہرے ہیں، میں حاضر خدمت ہوا، مولوی صاحب بڑی محبت سے ملے اور دیر تک باتیں کرتے رہے اتنی مدت گزرنے کے بعد ساری گفتگو تو یاد نہیں رہی البتہ ایک بات آج تک یاد ہے، ذکر کچھ مقرر و مدرس کا تھا، فرمایا تقریر و تدریس میں بڑا فرق ہے، جو اچھا مدرس ہوگا وہ اچھا مقرر نہیں ہو سکتا، اس طرح اچھا مقرر اور خوش بیان واعظ کامیاب مدرس نہیں ہو سکتا، دونوں کے معیار

(بقیہ حاشیہ ص ۹۳) پر غصہ آرہا تھا، مگر مولانا عین القضاۃ اسے داد دے رہے تھے، فرمانے لگے دیکھئے انھوں نے کیسی بہادری کی مگر بیچارہ زخمی ہو گئے ہیں یہ کہہ کر اس شخص کو علاج کے نام سے ایک معقول رقم دی، مدرسہ کے مصارف اور داد و دہش پر اندازہ ہے کہ اس سستے زمانہ میں دو ڈھائی لاکھ سالانہ سے کم خرچ نہ ہوتے ہوں گے، آج کے حساب سے یہ رقم پچیس تیس لاکھ کے برابر ہوگی، اتنی بڑی رقم کہاں سے آتی تھی یہ بات آج تک واضح نہیں ہو سکی ہے، بعض لوگوں کا خیال ہے کہ مولانا کے کچھ مالدار معتقد تھے، وہ رقوم بھیجا کرتے تھے، لیکن اس کا پکا دستاویزی ثبوت نہیں ملتا کچھ لوگ کیمیا اور دست غیب کی باتیں کرتے تھے، مگر مولانا کی زبان سے اس کی تصدیق نہیں ہوئی، بلکہ بعض لوگوں نے تردید نقل کی ہے، الغرض کوئی بات قطعیت سے نہیں کہی جا سکتی، ان کے ذی علم، صاحب بصیرت اور صاحب دل معاصر حکیم سید عبدالحئی صاحب کا بیان ہے،

ھو فقیر لا مال لہ ولا یاخذ عن	وہ فقیر تھے، ان کے پاس مال قطعی نہیں
احد درھما ولا دنیارا واللہ	تھا، نہ وہ کسی سے ایک درہم اور
اعلم من این یصل الیہ المال	دینار قبول کرتے تھے، خدا معلوم اتنا
الخطیر للمدرسۃ وللا عطاء	زیادہ مال ان کے پاس کہاں سے
کل یوم صباحا ومساء لکل	آتا تھا، جو مدرسہ کے لیے اور روزانہ

و ذوق میں بڑا فرق ہوتا ہے ۔ ایک کا کام علمی تحقیق ہے، اور دوسرے کی غرض دل پذیر انداز میں پبلک کی تفہیم ہے، اس وقت تو یہ بات سمجھ میں نہیں آئی، لیکن جب عمر آگے بڑھی اور دونوں لائنوں کا تجربہ ہوا تو پتہ چلا کہ مولوی صاحب نے کتنے تجربہ کی بات کہی تھی، بعض اوقات چوٹی کے واعظوں اور خطیبوں کو مسند درس پر دیکھا تو ان کی خوش بیانی اور نکتہ آفرینی طلبہ کے لیے وبال جان نظر آئی، اور جب کوئی مدرس محفل وعظ میں نظر آیا تو اس کا علمی انداز بیان مضحکۂ روزگار سمجھا گیا، ایک مرتبہ ایک بڑے مدرس نے قد افلح المومنون کی تفسیر مجمع عام میں بیان کی انھوں نے فرمایا مومنو خوش ہو جاؤ تمھاری کامیابی یقینی ہے دیکھتے نہیں ہو کہ ماضی پر قد داخل ہے اس علمی نکتہ کو عوام کیا سمجھ سکتے سب ہنس پڑے، اور مدتوں یہ کہہ کر ان کا مذاق اڑاتے رہے کہ ماضی پر

(بقیہ ص ۹۴) من بفد علیہ من العرب و	صبح و شام عرب و عجم کے آنے
والعجم فانہ فی انفاق المال	والوں کو دیا جاتا تھا، وہ مال کے
کالریح المرسلۃ ۔	صرف کرنے میں باد رواں کی
(نزہۃ الخواطر۔ جلد ۸)	مانند ہیں ۔

سنہ ۱۳۴۳ھ (سنہ ۱۹۲۵ء) میں علم و کمال، تقوی و طہارت اور جود و عطا کا یہ آفتاب غروب ہو گیا قلب کی تکلیف کچھ عرصہ سے رہنے لگی تھی، رجب کی دوسری تاریخ تھی، حسب معمول عصر کے بعد حجرہ کا دروازہ کھلا ہوا تھا، اور لوگ دیدار و عرض حال کے لیے جمع تھے، اس موقع پر ایک عربی داں ایرانی حاضر خدمت ہوا، اور دوران گفتگو زہد و ترک دنیا کے بارہ میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کے کچھ شعر پڑھے دل پر ان کا ایسا اثر ہوا کہ سر سجدہ میں جھک گیا اور روح قفس عنصری سے پرواز کر گئی، بجلی کی طرح یہ خبر سارے شہر میں پھیل گئی صبح ۳ رجب کو مدرسہ فرقانیہ میں نماز جنازہ ہوئی اور وہیں اپنے والد کے پہلو میں دفن ہوئے۔

قدر داخل ہو گیا ہے،

لکھنؤ کی اس آمد نے منتظمین ندوہ کو عوض معروض کا موقع دیا، ڈاکٹر عبد العلی صاحب مرحوم اس کام پر مامور ہوئے، وہ مولوی صاحب کے مخلص دوست اور ان کے علم کے قدر داں حکیم سید عبد الحیٔ صاحب مرحوم کے صاحبزادہ تھے، اس لئے ان کی درخواست رد نہ کر سکے، اور جولائی ۱۹۲۸ء (۱۳۴۶ھ) میں دوبارہ ندوہ تشریف لے آئے۔

ان کی تشریف آوری سے دار العلوم میں پھر رونق آگئی، اور حدیث کے اسباق طلبہ کی توجہ کا مرکز بن گئے۔ مولوی صاحب کی تقریر میں زیادہ روانی اور خوش بیانی نہ تھی، اپنا مطلب سیدھی سادی زبان میں بیان کرتے تھے، مگر ان کا علم جلد دلوں پر اپنا سکہ جما لیتا تھا۔ درس کے اوقات کے علاوہ بھی طلبہ ان کے یہاں جاتے تھے، اور ان کی نگرانی میں تحقیقی کام کرتے تھے، بعض مسائل پر مولوی صاحب نے خود بھی لکھا تھا، مگر کوئی بڑی کتاب نہیں لکھی تصنیف کی طرف زیادہ توجہ نہیں تھی، مطالعہ اور تدریس ہی میں جی لگتا تھا، انتظامی کاموں سے دلچسپی نہیں تھی، علمی انہماک کسی اور طرف توجہ کرنے کا موقع نہیں دیتا تھا، لیکن مولانا حفیظ اللہ صاحب کی سبکدوشی کے بعد ۱۳۵۱ھ (۱۹۳۲ء) میں اہتمام کی ذمہ داریاں بھی ان پر پڑ گئیں تو انھوں نے خوش اسلوبی کے ساتھ انھیں پورا کرنے کی کوشش کی حسن اتفاق سے دفتری اور انتظامی کاموں کے لئے ان کو بڑے منتظم، خوش سلیقہ اور مستعد معاون مل گئے تھے، شروع میں مولانا محمد عمران خان ندوی نے منصرم کی حیثیت سے انتظامی اور دفتری کاموں کو سنبھالا[۱] ان کے مصر جانے کے بعد مولوی نجم الدین[۲]

---

[۱] ندوہ میں حصول تعلیم کے بعد پھر انگریزی پڑھی، اور ایم۔ اے پاس کیا شروع میں کئی برس ندوہ میں منصرم رہے پھر محکمہ تعلیم میں ملازمت کر لی جون ۱۹۷۵ء میں نیکنامی کے ساتھ سبکدوش ہو گئے ہیں،

احمد صاحب قدوائی اور افتخار حسین صاحب[۱] قدوائی نے یہ خدمت انجام دی، اس بنا پر اہتمام کے کاموں میں کبھی کوئی دشواری محسوس نہیں ہوئی، اور پیچیدہ سے پیچیدہ معاملات خوش اسلوبی سے حل ہوتے رہے، مولوی صاحب کو اپنے ان معاونوں پر پورا اعتماد تھا، اور یہ لوگ بھی دل و جان سے ان کے خیر خواہ اور وفادار تھے،

ماتحتوں کے ساتھ برتاؤ

ماتحتوں کے ساتھ بڑا اچھا سلوک تھا، مدرسین ہوں یا دفتری کارکن اعلیٰ ملازمین ہوں یا ادنیٰ سب سے بڑی محبت اور شفقت کے ساتھ پیش آتے تھے اور اپنے برتاؤ سے یہ محسوس نہ ہونے دیتے کہ وہ کوئی افسر ہیں ڈانٹنا تو بڑی بات ہے تیز گفتگو بھی شاید ہی کسی نے کبھی سنی ہو، ماتحتوں کی عزت اور آزادی کا لحاظ رکھتے تھے اور دباؤ کے بجائے محبت سے کام لینے کے عادی تھے، آج بھی ان کے زمانہ کے جو اشخاص موجود ہیں وہ ان کے اخلاق کو یاد کرتے ہیں، ان کی شفقت و مہربانی کا اندازہ کرنے کے لیے ایک واقعہ بیان کیا جا رہا ہے، ندوہ کے بعض اساتذہ اور کارکنوں نے اخوان الصفا کے نام سے ایک حلقۂ احباب قائم کیا تھا، مولانا محمد ناظم[۲]، مولانا محمد عمران خان، مولوی نجم الدین قدوائی، ماسٹر عبد الحق[۳]، مولانا ابوالحسن علی وغیرہ آٹھ دس اصحاب اس میں شامل تھے، ہر ہفتہ

(بقیہ حاشیہ ص ۹۶) انتظامی کاموں کے ساتھ تصنیف و تالیف کا بھی ذوق ہے کئی کتابیں لکھی ہیں۔

[۲] بہت نو عمری سے ندوہ کی خدمت کر رہے ہیں، اس وقت دار العلوم کے منصرم ہیں اور مستعدی، کارکردگی، سلیقہ اور حسن انتظام میں مشہور ہیں، [۱] ندوہ میں عربی ادب کے استاد تھے اپنے موضوع سے گہری واقفیت تھی، عربی اہل زبان کی طرح بولتے اور لکھتے تھے، کچھ عرصہ ندوہ کے مہتمم بھی رہے تقسیم ملک کے بعد پاکستان چلے گئے، کئی برس جامعہ عباسیہ بہاولپور کے پرنسپل رہے، ڈیڑھ دو سال کے قریب جامعہ مدینہ منورہ میں استاد بھی رہے، ملازمت کے بعد اب آج کل کراچی میں اہل عیال کے ساتھ مقیم ہیں۔

کسی نہ کسی کی طرف سے دعوت ہوا کرتی تھی، ایک مرتبہ میں نے اپنی باری میں مولوی صاحب کو بھی دعوت دے دی، اس دن کسی ضرورت سے انھیں امین آباد جانا پڑا، اور اتفاق سے واپسی میں دیر ہوگئی کوئی طنطنہ والا مہتمم ہوتا تو جب تک وہ آنہ جاتا کسی کو کھانا شروع کرنے کی جسارت نہ ہوتی، مگر مولوی صاحب کی شفقت کی بنا پر جب زیادہ دیر ہوئی تو کھانا شروع کردیا گیا، کھانے والے بے تکلف کھاتے رہے، اور نکالنے والے جی بھر کر نکالتے رہے، نتیجہ یہ ہوا کہ پلاؤ، زردہ اور دوسرے خاص کھانے سب ختم ہوگئے، اور صرف روٹیاں باقی رہ گئیں، اتنے میں مولوی صاحب آگئے، لیکن یہاں کیا رکھا تھا، سب چپ لیکن وہ انداز سے صورت حال سمجھ گئے، اور ناراضگی کے بجائے ہمدردی کرنے لگے پریشان نہ ہو، کبھی ایسا بھی ہوجاتا ہے کمرہ میں میرا کھانا رکھا ہے، تم لوگ فکر نہ کرو، لیکن ہم لوگوں کو بہت شرمندگی تھی، رات زیادہ ہوچکی تھی، مگر حسن اتفاق سے اس زمانہ میں لکھنؤ میں نمائش ہو رہی تھی، وہاں کھانا مل گیا، لیکن جب کھانا لے کر ان کی خدمت میں پہونچے تو فرمایا میاں اس قدر تکلیف کی کیا ضرورت تھی، میں کوئی غیر نہیں ہوں، ایسی سردی میں تم لوگ اتنا کیوں دوڑے دیکھو تمھارے ہاتھ کیسے برف ہوگئے ہیں، وہ اس طرح باتیں کر رہے تھے کہ معلوم ہوتا تھا غلطی ہم نے نہیں کی بلکہ انھوں نے کی ہے، وہ ماتحتوں کے ساتھ بالکل برابری کا برتاؤ کرتے تھے، بیماری دکھ درد، شادی، غمی میں شریک ہوتے مفتی محمد یوسف[1] بیمار ہوئے

(بقیہ حاشیہ ص ۹۷) علمی اور دینی حلقوں میں عزت اور قدر کی نظر سے دیکھے جاتے ہیں۔

[3] ندوہ میں انگریزی اور حساب پڑھاتے تھے، بڑے دین دار اور مخلص تھے، جوانی ہی میں انتقال ہوگیا۔

[4] عربی ادب کے استاد تھے، بڑے نیک اور مرنجان ومرنج تھے، اپنی قابلیت اور نیکی کی وجہ سے اساتذہ وطلبہ دونوں میں مقبول ومحترم تھے، صوبہ بہار کے رہنے والے تھے، ۱۹۷۲ء میں لکھنؤ میں انتقال ہوا عمر پچاس کے قریب ہوگی۔

تو ایسی تیمارداری کی کہ ان کے حقیقی عزیز بھی ویسی نہ کرتے، مولانا عبدالرحمن نگرامی[1] کا انتقال ہوا، تو تقریباً تیس میل کا سفر کرکے جنازہ میں شرکت کی اس زمانہ میں بسیں نہیں چلتی تھیں، اسٹیشن سے نگرام تک ۸ میل کے قریب پیدل گئے، ندوہ کے اساتذہ میں اکثر تو ان کے شاگرد تھے، لیکن جو شاگرد نہیں تھے وہ بھی ان کا احترام کرتے تھے، مولوی صاحب بھی سب کا خیال رکھتے، یوں تو سبھی کے ساتھ ان کا برتاؤ اچھا تھا، لیکن عربی کے استادوں[2] میں شاہ حلیم عطا مرحوم[3] اور انگریزی کے استادوں میں ماسٹر محمد سمیع صدیقی[4] سے خاص تعلق خاطر تھا، ان کے علم، تجربہ اور صلاحیت کار کی بڑی قدر کرتے تھے، یہ لوگ بھی ان کے خلوص بزرگی اور حسن سلوک کے معترف تھے۔

[1] ندوہ کے بڑے ہر دلعزیز استاد تھے، ان کی ذات میں ایسی کشش تھی کہ بہت کم دیکھنے میں آئی ہے، تقریر بڑی پرزور موثر اور مدلل ہوتی تھی، قرآن مجید پر بڑا عبور تھا، اسلام کی تعبیر نئے انداز میں بہت خوبی کے ساتھ کرتے تھے، جدید تعلیم یافتہ طبقہ میں ان کا بڑا اثر تھا، قد چھوٹا لیکن دل بہت بڑا تھا، لباس اور معاشرت میں سادگی پسند کرتے تھے، ملازم تک سے مساوات کا برتاؤ کرتے علی محمد جو اب ندوہ کے کتب خانہ میں چپراسی ہیں، شروع میں وہ مولانا عبدالرحمن کے ملازم تھے، ساری تنخواہ ان کے حوالہ کر دیتے، وہی ان کے گھر خرچ بھیجتے اور ان کی ضروریات طعام ولباس کا انتظام کرتے کبھی حساب نہیں لیا آج تک وہ ان کے سلوک کو یاد کرتے ہیں، ۲۰ مارچ ۱۹۲۶ء کو ۴۰ برس کی عمر میں انتقال ہوگیا، ندوہ سے پہلے مدرسۃ الاصلاح سرائے میر اور مولانا آزاد کے مدرسہ اسلامیہ کلکتہ میں مدرس تھے، سچ کی ادارت میں مولانا عبدالماجد دریابادی اور مولانا ظفر الملک علوی کے ساتھ شریک تھے، ان کے شاگردوں میں مولانا امین احسن اصلاحی، شاہ معین الدین احمد ندوی، مولانا ریاست علی ندوی، مولانا نورالحق پشاوری وغیرہ متعدد اصحاب

غریب نوازی امرار اغنیا اور اصحاب وجاہت سے مولوی صاحب زیادہ تعلق نہیں رکھتے تھے، لیکن غریبوں اور معمولی حیثیت کے لوگوں سے ایسا برتاؤ کرتے کہ وہ ان کے گرویدہ

(بقیہ حاشیہ ص ۹۹) قابل ذکر ہیں، میں ان کے زمانہ میں ابتدائی درجوں میں تھا، قرآن مجید کے دو پاروں کا ترجمہ اور مجموع الادب ان سے پڑھی ہے، کبھی کبھی ان کی تقریریں سنیں، بعض اوقات انکی باتیں بھی سننے کا موقع ملا ان کی تاثیر آج تک محسوس کرتا ہوں ان غیر معمولی صلاحیتوں کی بنا پر مولانا شبلی نعمانی کو ان کی تربیت کی جانب خاص توجہ تھی، اور مولانا سید سلیمان ندوی انھیں اپنی جماعت کا لعل شب چراغ سمجھتے تھے، وفات پر ان کے استادوں اور بزرگوں نے کہا کہ آج ہم لوگ یتیم ہو گئے۔

۲؎ سطون ضلع رائے بریلی کے رہنے والے تھے بڑے صاحب علم اور صاحب نظر تھے، فتانی العلم کے الفاظ کتابوں میں پڑھے تھے، شاہ صاحب کو دیکھ کر ان کا مفہوم سمجھ میں آیا، علم ہی ان کا اوڑھنا بچھونا تھا، مطالعہ کتب میں ایسا انہماک تھا کہ یاد و شاید حافظہ اس غضب کا تھا کہ جو پڑھ لیتے ازبر ہو جاتا، کتابوں کے سیکڑوں صفحات زبانی یاد تھے، اشعار کا تو شمار نہیں، علوم اسلامیہ کی زندہ انسائیکلوپیڈیا تھے، علامہ ابن تیمیہ اور حافظ ابن قیم کے مداح اور ان کی کتابوں کے تقریباً حافظ تھے، شرک و بدعات سے متنفر اور توحید و سنت کے دل دادہ تھے، اکتوبر ۱۹۵۵ء میں وفات پائی۔

۳؎ ماسٹر صاحب جونپور کے رہنے والے ہیں ۱۹۲۵ء میں ندوہ کے شعبۂ علوم جدیدہ سے وابستہ ہوئے اور زندگی کا بہترین حصہ ندوہ کی خدمت میں صرف کیا، یہاں کی فضا ایسی بھائی کہ دارالعلوم کے متصل زمین خرید کر مکان بنا لیا، انگریزی زبان اور علوم جدیدہ پر اچھی نظر ہے، انگریزی میں سیرت نبوی پر ایک کتاب لکھی ہے غالب کے اشعار کا ترجمہ بھی کیا ہے، صوم و صلوٰۃ کے بہت پابند ہیں بڑے خلیق اور ہمدرد ہیں لیکن مزاج کی نرمی کے باوجود خیالات میں مستحکم اور اصول میں پختہ ہیں، علمی اور انتظامی صلاحیتوں کی بنا پر ممتاز کالج لکھنؤ کے عرصہ تک پرنسپل رہے، اب ملازمت سے سبکدوش ہو گئے ہیں، لیکن اب بھی علمی اور تدریسی کاموں سے دلچسپی رکھتے ہیں۔

ہو جاتے، یہیں ایک چائے فروش تھا، جو صبح کو ندوہ میں کشمیری چائے اور بالائی اور شام کو کھیر فروخت کرتا تھا، دودھ مولوی صاحب اس سے لیتے تھے، لکھنؤ میں راجستھان کا سا دودھ مشکل سے مل سکتا ہے، لیکن یہیں کوشش کر کے خالص دودھ انھیں پہونچاتا تھا، انکی اس خدمت سے وہ بہت متاثر تھے، اکثر اس طرح ممنونیت کا اظہار کرتے گویا انھیں بلا قیمت مل رہا ہے، اسی طرح ایک صاحب حافظ عبد القیوم تھے، وہ دیہات سے گھی لایا کرتے تھے، مولوی صاحب ان کی بڑی خاطر کرتے تھے، میں نے خود دیکھا ہے کہ مولوی صاحب فرش پر بیٹھے مطالعہ کر رہے ہیں اتنے میں حافظ صاحب آگئے تو فرمایا آرام کر لو وہ بہترا عذر کرتے مگر مولوی صاحب جب تک ان کو لٹا نہ لیتے چین نہ آتا۔

مساوات پسندی مولوی صاحب امتیاز کو سخت ناپسند کرتے تھے، سفر و حضر ہر جگہ مساوات کا خیال رہتا ایک مرتبہ مولانا حبیب الرحمٰن خاں شیروانی لکھنؤ آئے ان سے ملاقات کے لیے منشی احتشام علی صاحب کی کوٹھی پر گئے، اس وقت ایک کرسی خالی تھی، مگر جب تک اپنے ساتھ کے دو طالب علموں کے لیے بھی کرسیاں منگوا نہیں لیں خود نہیں بیٹھے، ۱۹۳۶ء میں ندوہ کے کام سے ان کے ساتھ مدراس تک جانے کا اتفاق ہوا اس سفر میں میرے علاوہ مولانا ابو الحسن علی اور مولانا عمران خاں صاحب بھی ہمراہ تھے، مولوی صاحب خاصے ضعیف ہو چکے تھے، ہم لوگوں نے بہترا چاہا کہ ان کو اونچے درجہ میں بٹھا دیں مگر وہ کسی طرح راضی نہ ہوئے، اور تیسرے ہی درجہ میں ہم لوگوں کے ساتھ رہے، کھانے پینے اور رہنے میں بھی کسی قسم کا امتیاز گوارا نہ کیا، ایک مرتبہ ایک تقریب کے سلسلہ میں ہمارے گاؤں[۱] گئے، اسٹیشن پر سواریاں کم تھیں بہتیری کوشش کی گئی کہ وہ سواری پر بیٹھ جائیں مگر

۱؎ تھو لینڈی، ضلع رائے بریلی۔

کسی طرح تیار نہیں ہوئے، فرمایا کیا میں کسی سے کمزور ہوں اور تین میل پیدل رات میں چلے گئے،
اُس دن کچھ بارش ہوگئی تھی سڑک کچی تھی، کہیں پاؤں پھسلتا تو فرماتے گرنے سے نہیں ڈرتا
لیکن تاریخ بن جانے کا خیال ہے، گاؤں پہونچے تو لوگوں نے بہت چاہا کہ انھیں ممتاز جگہ پر
بٹھائیں، مگر قالین اور گدے کا کیا ذکر ہے، انھوں نے کبھی کھری چارپائی پر بھی تنہا بیٹھنا
پسند نہ کیا۔

مہمان نوازی فرماتے تھے کہ کبھی اکیلے کھانا نہیں کھایا، مہمانوں کی آمد سے بے حد خوش ہوتے
ان کی بڑی خاطر کرتے، کوئی ان کا شناسا یا شاگرد اگر ان کے دسترخوان پر نہ پہونچتا تو بہت
ناخوش ہوتے، جامعہ کی طالب علمی کے زمانہ میں میں ایک مرتبہ لکھنؤ گیا دو تین دن مولوی
صاحب کے ساتھ کھانا کھایا اتفاق سے قیام طویل ہوگیا میں ناغہ کرنے لگا وہ کھانے
کے وقت تلاش کراتے ایک دن مل گیا تو فرمایا کہاں غائب رہتے ہو میں نے عرض کیا قیام
زیادہ دن رہے گا آپ کو کہاں تک زحمت دوں فرمایا "حضرت ہم پر رحم نہ کیجئے آپ ہمارا
نقصان کرتے ہیں، ہمیں اتنا ہی ملتا ہے جتنا ہمارا خرچ ہوتا ہے، بعض اوقات ایسے
مہمان بھی آجاتے جو کھانا بھی کھاتے اور چلتے وقت کرایہ بھی مانگتے ایک مرتبہ ایسا ہی ایک
واقعہ پیش آیا، وہ صاحب پشاور کے رہنے والے تھے، چلتے وقت کہا میرے پاس خرچ
بالکل نہیں رہ گیا ہے کرایہ کا انتظام کر دیجئے گھر پہونچ کر بھیج دوں گا، مگر پشاور پہونچ کر
منی آرڈر کے بجائے معذرت کا خط آیا، مولوی صاحب اس معذرت پر بہت خوش ہوئے،
مجھے خط دکھایا، اور فرمایا دیکھو کتنا اچھا آدمی ہے، روپیہ نہ بھیج سکا تو اپنی معذوری
کی اطلاع دے دی،

ان کے یہاں جدید تعلیم یافتہ اصحاب اور یونیورسٹیوں کے پروفیسر بھی آتے رہتے تھے

پروفیسر محمود شیرانی تو ہم وطن تھے، لکھنؤ یونیورسٹی کے لوگ پڑوسی تھے، ان کے علاوہ
دوسری یونیورسٹیوں کے اساتذہ بھی آیا کرتے تھے، ایک مرتبہ میری موجودگی میں بنارس
یونیورسٹی کے صدر شعبہ اردو مولوی مہیش پرشاد آئے تو ان کی بڑی خاطر کی، مہیش پرشاد صاحب
پر ان کے اخلاق اور حسن سلوک کا بہت اثر ہوا اور کہنے لگے مولانا آپ جیسے بزرگوں کے
برتاؤ نے میرے دل میں اسلام سے محبت پیدا کی ہے،

رواداری مولوی صاحب حنفی تھے، اور اپنے مسلک پر مستحکم تھے، مگر دوسرے مسلک
و مذہب کے لوگوں کے ساتھ ان کے بڑے اچھے تعلقات تھے، علمائے اہل حدیث سے بڑی بشاشت
سے ملتے ان کے کاموں کی قدر کرتے نواب صدیق حسن خان کی علم دوستی کی بڑی تعریف
کرتے، اور کہتے کہ انھوں نے حدیث کی نایاب کتابیں چھپوا کر اہل علم کو پہونچائیں مولانا بشیر احمد
سہسوانی کی اتباع سنت سے بہت متاثر تھے، ایک مرتبہ مسواک کی تاکید کی حدیثیں
پڑھی جارہی تھیں فرمانے لگے مولانا بشیر احمد سہسوانی پان نہیں کھاتے تھے، اور کہتے تھے کہ
یہ مسواک کے مقصد کے خلاف ہے، اسی طرح ٹونک کے سید عرفان اور سید مصطفےٰ
کی بے حد تعریف کرتے تھے، اور سنت نبوی کے ساتھ ان کی والہانہ شیفتگی کے واقعات
بڑے کیف کے ساتھ سناتے تھے، مولانا محمد سورتی کے ساتھ بھی خوشگوار تعلقات تھے خود
ان کے شاگردوں میں متعدد اشخاص اہل حدیث تھے، ان سے بڑی محبت سے ملتے اور
خاطر مدارات کرتے۔ شیخ تقی الدین ہلالی ندوہ میں کئی سال شیخ الادب رہے، بڑے کٹر
سلفی تھے، ان سے بہت اچھے روابط تھے، وہ موجود ہوتے تو اصرار کرکے انھیں کو امام بناتے
ان معاملات میں وہ بڑے فراخ دل اور وسیع الظرف تھے، لیکن تعصب اور زبان درازی
کو پسند نہیں کرتے تھے، وہ کہتے تھے حنفی، شافعی، اہل حدیث جو مسلک بھی آدمی کو

پسند ہو اختیار کرے لیکن دوسروں کی دل آزاری، ان کے اماموں اور بزرگوں کی توہین اور ان کے مذہب پر طعن و تشنیع جائز نہیں، دلائل و براہین سے اپنے خیالات کی صحت ثابت کرنے کی اجازت ہے، مخالف کی غلطی واضح کرنے میں بھی کوئی مضائقہ نہیں، لیکن ادب و تہذیب کا دامن ہاتھ سے نہ چھوٹنا چاہیے،

شاگردوں کا خیال

شاگردوں سے بڑی شفقت و محبت کا برتاؤ کرتے تھے انہیں اپنی اولاد پر ترجیح دیتے تھے، اور ان کی سود و بہبود کی ہمیشہ فکر رکھتے تھے، کسی شاگرد کی آمد کی خبر سنتے تو ملاقات کے لیے بے چین ہو جاتے۔ بسا اوقات فرط محبت میں اسکے گھر ہو پہنچ جاتے، پھر اسے اپنی قیام گاہ پر لاتے اور جب تک بس چلتا اس کو اپنا مہمان رکھتے۔

بڑے نامور شاگردوں کا ذکر نہیں مجھ جیسے حقیر اور بے مایہ شاگردوں کے ساتھ جو سلوک کرتے تھے، اس کی مثال مشکل سے ملے گی، خود بیانی معیوب نہ ہوتی تو بہت سے واقعات بیان کئے جا سکتے تھے، مگر مولوی صاحب کی شفقت و محبت اور عنایت و حسن سلوک کا اندازہ کرنے کے لیے چند باتیں لکھی جا رہی ہیں

رمضان کی تعطیل میں گھر جا رہا تھا، جی چاہا کہ زیلعی کی نصب الرایہ ساتھ لیتا جاؤں، فرصت میں کچھ پڑھ ڈالوں گا، اس وقت تک ڈابھیل والا نیا اڈیشن شائع نہیں ہوا تھا، کتاب بہت کمیاب تھی، مولوی صاحب کے پاس بہت پرانا بوسیدہ نسخہ تھا، میں نے ان سے کتاب مانگی فرمانے لگے میاں یہ کتاب مجھے بے حد عزیز ہے، مگر تم اس سے بھی زیادہ عزیز ہو لے جاؤ ایک مرتبہ مجھے قرض کی ضرورت ہوئی مولوی صاحب سے کچھ روپیے لئے جب واپس کرنے گیا تو فرمایا میں نے واپسی کے لئے روپیے

نہیں دیے تھے، یہ ملازمت کی ذلت میں نے تمہیں لوگوں کے لیے گوارا کی ہے، جامعہ کی طالب علمی کے زمانہ میں خاص طور سے وہاں ملنے کے لئے گئے۔ میرے اور رئیس احمد جعفری مرحوم کے صحیح بخاری کے کچھ حصے درس میں باقی رہ گئے تھے، ان کے پورا کرنے کے لیے گرمی کی تعطیل میں ٹونک نہیں گئے، لکھنؤ میں مئی جون کی تپش میں کتاب پڑھائی، اور پھر اپنی دستخطی سند حدیث عطا فرمائی، جو ہم لوگوں کے لیے سرمایۂ افتخار ہے، اس زمانہ میں ان کے گھٹنے میں شدید درد تھا، ہفتوں بے چین رہے مگر اس تکلیف کے باوجود کئی کئی گھنٹے سبق پڑھاتے، مولوی صاحب حاجی امداد اللہ مہاجر مکیؒ کی طرف سے صاحب اجازت تھے، مگر کم لوگوں کو بیعت کرتے تھے لیکن کمال شفقت کی بنا پر مجھے، رئیس احمد اور عبدالرشید نعمانی کو بیعت سے مشرف فرمایا،

اپریل ۳۶ء میں ندوہ میں ملازم ہو کر آیا تو تنخواہ بہت کم تھی، مولوی صاحب نے پلنگ، دری، لالٹین، اور دس روپیے عنایت کئے اور جب تک ضرورت کے مطابق تنخواہ میں اضافہ نہیں ہو گیا کھانا اپنے ساتھ کھلاتے رہے، تعطیل میں گھر گئے تو وہاں سے منی آرڈر بھیجا تاکہ مجھے کوئی پریشانی نہ ہو، لکھنؤ میں جب تک رہے برابر خیال رکھا، اور جب ٹونک چلے گئے تو وہاں سے بھی میرے حالات دریافت کرتے رہتے، میرے ساتھیوں میں رئیس صاحب کے علاوہ مولانا سید ابوالحسن علی، اور مولانا عبدالرشید نعمانی[1] پر

---

[1] جے پور کے رہنے والے تھے، کئی سال سفر و حضر میں مولوی صاحب کے ساتھ رہے، ۴۷ء سے پہلے کئی برس ندوۃ المصنفین دہلی سے وابستہ رہے، لغات القرآن کی کئی جلدیں اسی دور کی یادگار ہیں تقسیم کے بعد پاکستان چلے گئے، وہاں کچھ عرصہ نیو ٹاؤن کراچی کے دارالعلوم سے متعلق رہے پھر جامعہ عباسیہ بھاولپور میں حدیث کے استاد مقرر ہوئے، متعدد کتابیں لکھیں جن میں سے

خاص عنایت تھی، مولانا عبدالرشید نعمانی نے حدیث شریف کے ساتھ تصوف و سلوک میں بھی ان سے فیض حاصل کیا تھا، اور اب بھی تدریس و تصنیف کے ذریعہ استاد کا نام روشن کئے ہوئے ہیں۔ مولوی صاحب کے بعد مولانا احمد زکریا صاحب سے بھی استفادہ کرتے رہتے ہیں۔

جدید مسائل مولوی صاحب نے پرانے زمانہ میں تعلیم حاصل کی تھی، لیکن آگے چل کر تجربے اور حالات سے واقف کر دیا تھا، جدید تعلیم یافتہ اصحاب سے ملنا جلنا بھی ہوتا تھا اس بنا پر وہ نئے زاویہ نظر کو کسی قدر سمجھنے لگے تھے، اس وجہ سے بعض ایسے مسائل میں جن کی بحث و تنقیح سے علماء اب تک فارغ نہیں ہوئے ہیں، وہ واضح رائے رکھتے تھے، تار اور ٹیلیفون پر رویت ہلال کی اطلاع کو وہ جائز سمجھتے تھے، ایک مرتبہ لکھنؤ میں مطلع صاف نہ تھا، تو مفتی کفایت اللہ کو تار دے کر دریافت کیا اور اس پر عمل کیا، لاؤڈ اسپیکر پر نماز بالکل جائز سمجھتے تھے، انگریزی تعلیم کی ضرورت کے قائل تھے، بڑھاپے میں اور دوسرے مشاغل کے ساتھ انگریزی پڑھنے کا موقع کہاں تھا، لیکن چکوں پر دستخط کر لیا کرتے تھے، اور چند ضروری جملے بول بھی لیتے تھے، ایک لڑکا ندوہ میں داخل ہوا تھا اور ان کے کمرے ہی میں رہتا تھا، وہ اردو نہیں سمجھتا تھا، اس سے حسب ضرورت دو چار جملے بول لیتے تھے، انگریزی کی تحصیل کو بہت ضروری سمجھتے تھے، کہتے تھے طالب علمی کے زمانہ میں اندازہ نہیں ہوا، ورنہ میں اسے بھی پڑھ لیتا، عربی مدارس کے طلبہ کو خاص طور سے اس جانب توجہ دلاتے تھے، اس زمانہ میں پنجاب یونیورسٹی کے امتحانات کے ذریعہ انگریزی تعلیم کا آسان راستہ نکل آیا تھا، ان کے کئی شاگردوں نے اس طرح ایم۔ اے کا امتحان پاس کیا، خود ان کے بڑے لڑکے مولانا سعید حسن نے علوم اسلامیہ کی تحصیل و

(بقیہ حاشیہ ص ۱۰۵) سنن ابن ماجہ کی شرح خاص طور سے قابل ذکر ہے ۔۔۔ ٹرینیڈاڈ (Trin[illegible]) سے آیا تھا۔

تکمیل کے بعد اسی طرح بی۔ اے پاس کیا، لیکن جدید تعلیم کے ساتھ وہ دینی زندگی اور اسلامی شعائر میں ذرا سی غفلت اور کوتاہی کو بھی گوارا نہیں کرتے تھے، وہ "در کفے جام شریعت در کفے سندان عشق" کے قائل تھے، اور "جام و سندان باختن" کو مردانگی سمجھتے تھے، ندوہ کے بانیوں نے دین و دنیا کی باہم آمیزی کا جو تخیل پیش کیا تھا وہ اس کی قدر کرتے تھے، لیکن کچھ ادھر سے کچھ ادھر سے لے بھاگنے کو پسند نہیں کرتے تھے، بلکہ دونوں پہلوؤں میں کمال حاصل کرنے کے خواستگار تھے، فرمایا کرتے تھے کہ تھوڑا علم نقصان پہونچاتا ہے۔

ندوہ سے استعفا اب عمر چہتّر سے متجاوز ہو چکی تھی، اگرچہ وہ اب بھی ضعف و انحطاط کو تسلیم نہیں کرتے تھے، اور جوانوں کی جوانی پر طنز کرتے رہتے تھے، کسی محنت طلب کام سے ہم لوگ اعراض کرتے تو کہتے کیسے جوان ہو ہم لوگ عرض کرتے مولوی صاحب جوانی آئی کہاں بچپن کے بعد ہی بڑھاپا آگیا تو مسکراتے اور اپنے شباب کے قصے بیان کرنے لگتے، لیکن عمر بہر حال کافی ہو چکی تھی، قویٰ کمزور ہو گئے تھے، اور جوانی کی یاد جوان نہیں کر سکتی تھی، عمر کی اس منزل میں قوت بخش دواؤں سے تقویت پہونچائی جاتی ہے، مگر وہ اس جانب متوجہ نہ تھے، عزیزوں، دوستوں اور مہمانوں پر سیکڑوں روپیے خوشی سے خرچ کر دیتے تھے، لیکن اپنی دوا کے لیے دو چار روپیے کا صرف بھی ناگوار ہوتا تھا، ایک مرتبہ ڈاکٹر عبدالعلی صاحب مرحوم نے ان کی حالت دیکھ کر ایک دوا لکھ دی، مولانا ابوالحسن علی ساتھ تھے، وہ دوا لے کر آئے پوچھا کتنے کی ملی یہ سن کر کہ اس کی قیمت چار روپیے ہے فرمایا فوراً واپس کر دو میں اپنی جان پر چار روپیے نہیں صرف کر سکتا بہتیری کوشش کی گئی کہ وہ راضی ہو جائیں مگر وہ کسی طرح اس پر آمادہ نہ ہوئے مجبوراً دوا واپس کر دی گئی، یہی حال

اپنی ذات کے لیے غذا کے اہتمام کا تھا، ضعف بڑھتا رہا، آخر عمر میں کبھی کبھی چکر بھی آجاتا تھا، ان حالات کی بنا پر ان کو گھر کا خیال آنے لگا لڑکے اور عزیز بھی اس پر زور دیتے تھے، ایک طرف یہ صورت حال تھی دوسری طرف لکھنؤ میں ان کے قدر داں بھی دنیا سے اٹھتے جا رہے تھے، ندوہ کے ماحول کو بھی اب وہ اپنے حسب حال نہیں پاتے تھے، بعض ارکان کا طرز عمل بھی ان کو پسند نہ تھا، مزاج میں انکسار اور فروتنی بہت تھی، لیکن اس کے ساتھ خودداری اور عزت نفس کا خیال بہت تھا، استخفاف اور اہانت کا ذرا سا شبہ بھی ہو جاتا تو بے حد رنج و تکلیف محسوس کرتے، وہ متکبر کے سامنے انکسار کے قائل نہ تھے، اور فرمایا کرتے تھے کہ متکبر کے مقابلہ میں تکبر ہی تواضع ہے، ایک طرف ان کے احساس کی نزاکت کا یہ حال تھا، دوسری طرف ارکان ندوہ میں جو لوگ ان کے قدر داں اور مزاج شناس تھے، ان میں سے اکثر دنیا سے رخصت ہو گئے تھے، یا از کار رفتہ ہو چکے تھے، ایسے اشخاص کم رہ گئے تھے، جو ان کے علم کی گہرائی، نظر کی وسعت، فکر کی بلندی، اور تحقیق کی ندرت کا پورا اندازہ کر سکتے، ان کا طرز تدریس بے حد مفید تھا، پچاس ساٹھ سال کا تجربہ اس کی تصدیق کر رہا تھا، لیکن اس کے افادہ کی پیمائش منٹوں اور گھنٹوں سے نہیں کی جا سکتی تھی، مولوی صاحب کہتے تھے کہ مدرس اپنے مضمون کو سمجھتا ہے، وہ اپنے طالب علموں کی استعداد بھی جانتا ہے اسے موقع و محل کا اندازہ ہوتا ہے، مباحث اس کی نظر میں ہوتے ہیں، وہ ان کے پیش کرنے کے ڈھنگ سے واقف ہوتا ہے، اور بحث کے پھیلانے اور سمیٹنے کے مواقع سے آگاہ ہوتا ہے، اچھا استاد بے محل وضاحت اور بے جا اختصار سے اجتناب کرتا ہے، وہ محفل وعظ اور مجلس درس کے فرق کو سمجھتا ہے، لیکن یہ باتیں ایسے لوگوں کو کس طرح سمجھائی جائیں، جنھوں نے کبھی اس کوچہ میں قدم نہیں رکھا ہے، وہ اہل علم و کمال کا احترام

کرتے تھے، اور ان کے مشوروں کو سر آنکھوں پر رکھتے تھے، مگر جو لوگ راہ علم کے شہسوار نہیں تھے، اور جنھیں درس و تدریس کا پورا تجربہ نہیں تھا وہ ان کی باتوں کو لائق التفات نہیں سمجھتے تھے، وہ قواعد و ضوابط کا احترام کرتے تھے، نظم و انتظام کے بھی قائل تھے، مگر مدرسہ کو ضابطہ گاہ اور قانون گھر نہیں، بلکہ دار العلم سمجھتے تھے، بالکل یہی خیال ایک مرتبہ ایک یونیورسٹی کے وائس چانسلر کی زبان سے سننے میں آیا، وہ قانون کے بجائے اخلاق سے کام لیتے تھے، اور زبان کو خاموش کرنے کے بجائے دل کو مطمئن کرنے کی کوشش کرتے تھے لیکن جو لوگ زجر و توبیخ اور عقوبت و تعزیر ہی کو اصلاح حال کا ذریعہ سمجھتے تھے، وہ انکی اس مصلحانہ حکمت اور حکیمانہ مصلحت کو مفید نہیں سمجھتے تھے ایک مرتبہ ایک صاحب نے ان سے کہا آپ کے اندر انتظامی صلاحیت نہیں ہے، اور قانون سے کام لینا نہیں جانتے ہیں یہ سن کر انھوں نے کہا کہ مجھے خوشی ہے کہ میں ایک درسگاہ کا سربراہ ہوں کسی کوتوالی کا کوتوال نہیں ہوں میں استادوں اور طالب علموں کی خدمت اور رہنمائی کے لیے آیا ہوں، چوروں اور ڈاکوؤں کا تعاقب کرنے کے لیے نہیں، مولوی صاحب مدرسہ کو مدرسہ سمجھتے تھے، وہ علم کی بالادستی کے قائل تھے، ان کی نظر میں درسگاہ کی روح رواں طلبہ اور اساتذہ ہی ہوتے ہیں، سارا اہتمام و انتظام انھیں کی خدمت کے لیے ہوتا ہے انھوں نے اپنے بزرگوں سے یہی سیکھا تھا، لیکن انھیں محسوس ہو رہا تھا کہ اب رنگ محفل بدلتا جا رہا ہے، ارکان بہرحال ارباب بست و کشاد تھے، گو ابھی مولوی صاحب کے سامنے کسی کو کھل کر بالادستی کے اظہار کی ہمت نہ تھی، مگر بعض لوگ کچھ مشورے دینے لگے تھے ان میں کبھی کبھی کسی قدر تنقید کا رنگ بھی آجاتا تھا، انھیں یہ باتیں ناگوار ہوتیں کبھی برداشت کر لیتے اور کبھی جواب دے دیتے آخر کار انھوں نے علحدگی کا فیصلہ کر لیا، اور ۲۰ ذی قعدہ ۱۳۵۶ھ

(۲۸ دسمبر ۱۹۴۰ء) کو ملازمت سے استعفا دے دیا۔

مولوی صاحب نے حالات کا صحیح اندازہ کر لیا تھا، ان کی قدردانی کی وہ کیفیت نہ تھی جو پہلے تھی، ان کی اہمیت اور ضرورت بھی ویسی محسوس نہ ہوتی تھی، جیسے پہلے محسوس کی جاتی تھی، یہی وجہ تھی کہ نہ ان کو روکنے کی کوئی خاص کوشش ہوئی نہ ان کو پھر بلانے کے لیے جد وجہد کی گئی، مولوی صاحب کو یہ باتیں ہمیشہ یاد رہیں، ٹونک پہونچنے کے بعد مجھے جو خط لکھا اس میں ان تلخیوں کے ذکر کے بعد لکھا کہ خدا کا شکر ہے، کہ میں ناگواریوں سے نجات پاکر وطن اور اعزہ کے خوشگوار ماحول میں آگیا ہوں آخر میں یہ آیت لکھی تھی، جس سے ان کی دلی کیفیت کا اندازہ ہوتا ہے۔

الحمد للہ الذی اذهب	خدا کا شکر ہے، جس نے ہم سے غم
عنا الحزن ان ربنا لغفور	دور کیا بے شک ہمارا پروردگار
شکور الذی احلنا دار	بخشنے والا قدردان ہے جس
المقامة من فضله لا	نے ہم کو اپنے فضل سے مستقل قیام
یمسنا فیها نصب ولا	گاہ میں ٹھہرایا، یہاں ہم کو نہ تو
یمسنا فیها لغوب۔	رنج و محن پہونچے گا، اور نہ ہمیں
(۳۵ سورۂ فاطر رکوع ۴)	یہاں خستگی اور تکان ہوگی۔

وفات

ٹونک پہونچ کر ان کی خلش دور ہوگئی، خدمت گزار لڑکوں، جاں نثار عزیزوں، ہمدرد دوستوں، اور قدر شناس ہم وطنوں کے درمیان ان کو سکون و اطمینان محسوس ہوا لیکن عمر خاصی ہو چکی تھی، ان کی بلند ہمتی اب بھی سپر افگندگی کے لیے آمادہ نہ ہوتی تھی، مگر پیرانہ سالی کے عوارض جو لکھنؤ ہی میں شروع ہو چکے تھے

برابر بڑھتے رہے، اور طبیعت کسلمند رہنے لگی، علاج معالجہ، دیکھ بھال اور خاطر مدارات کا بہترین انتظام تھا، گھر والے ہمہ وقت خدمت گزاری، اور راحت رسانی کی فکر میں لگے رہتے تھے، لیکن صحت میں جو انحطاط شروع ہو چکا تھا وہ رک نہ سکا، اور آہستہ آہستہ ضعف بڑھتا گیا بالآخر وقت موعود آپہونچا، کُلُّ نَفْسٍ ذَائِقَةُ الْمَوْتِ۔ لکھنؤ سے جانے کے تقریباً ڈیڑھ سال بعد طبیعت زیادہ خراب ہوئی، اور ۱۵ جمادی الاخری ۱۳۶۱ھ (۳۱ مئی ۱۹۴۲ء) کو بندہ اپنے مولیٰ کے حضور میں حاضر ہوگیا۔

جسد خاکی موتی باغ ٹونک میں سپرد خاک کیا گیا، اس وقت ہجری سن کے حساب سے سن اسّی کا تھا۔

اولاد اور شاگرد

وفات کے وقت بڑے صاحبزادہ مولانا سعد حسن خاں اور چھوٹے قاری اسعد حسن خاں موجود تھے، یہ لوگ کئی برس تک ٹونک ہی میں رہے، پھر جب ملک تقسیم ہوا تو دیگر عزیزوں کے ساتھ پاکستان چلے گئے۔ اور اپنے متعلقین کے ساتھ وہیں آباد ہوگئے ہیں۔ انکے ایک قریبی عزیز مفتی ولی حسن خاں بھی پاکستان میں ہیں اور دار العلوم نیوٹاؤن کراچی میں تدریس و افتاء کی خدمت انجام دے رہے ہیں، فقہ کی کتابوں پر ان کی نظر بڑی گہری ہے، اور بڑے ذی علم اور صاحب بصیرت مفتی سمجھے جاتے ہیں کچھ اعزہ ہندوستان میں بھی ہیں شاگرد مختلف جگہوں میں پھیلے ہوئے ہیں لیکن انکی کوئی مفصل فہرست اب تک مرتب نہیں ہو سکی ممکن ہے اس مضمون کی اشاعت کے بعد اسکی کوئی صورت نکل آئے۔

مولوی صاحب کی بڑی آرزو تھی کہ ان کے بعد ان کے شاگرد حدیث کا درس دیتے رہیں تاکہ فیوض و برکات کا یہ سلسلہ جاری رہے اس طرح ان کا روحانی رابطہ بھی قائم رہے گا، اور انکی روح کو ثواب بھی پہونچتا رہے گا،

خانِ آرزو اور نظریۂ توافقِ لسانین

از

ریحانہ خاتون صاحبہ ایم اے، ایم۔فل، شعبۂ فارسی مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

خانِ آرزو شاید پہلے عالم ہیں جنھوں نے توافقِ لسانین کے نظریہ کو پیش کیا، یہ نظریہ دو طرح کا ہے، ایک فارسی اور کتابی ہندی کے ایک ہونے کا نظریہ، اور دوسرا فارسی اور عربی کے ہم رشتہ زبان ہونے کا تصور، جہاں تک پہلے نظریہ کا تعلق ہے، اس میں بڑی حد تک صداقت ہے، اور مجموعی طور پر انھوں نے جو باتیں بطور کلیات بیان کی ہیں، وہ بالکل صحیح ہیں، یہ نظریہ جو اب عام ہو گیا ہے، سب سے پہلے خانِ آرزو کی بدولت ہی روشناس ہو سکا ہے، لیکن ان کا دوسرا نظریہ یعنی عربی اور فارسی کے مماثل زبان ہونے کا تصور غلط ہے، انھوں نے اس سلسلے میں جو باتیں لکھیں، وہ دراصل بڑی غلط فہمی پر مبنی ہیں، عربی اور فارسی ہم رشتہ زبانیں نہیں ہو سکتیں، عربی سریانی خاندان اور فارسی آریائی زبان سے تعلق رکھتی ہے، یہ دو الگ خاندانوں کی زبانیں ہیں، جو تاریخ کے کسی قدیم ترین دور میں بھی ایک نہیں تھیں، وہ فارسی اور عربی کے چند لفظوں کی مماثلت سے اس نتیجہ پر پہنچے کہ یہ مماثلت کسی اتفاق کا نتیجہ نہیں ہو سکتی، مگر جن فارسی لفظوں کو انھوں نے عربی لفظوں کے مماثل بتایا ہے، وہ دراصل فارسی لفظ ہی نہیں ہیں، بلکہ وہ پہلوی زبان کی ایک املائی صورت ہے، جس کو اصطلاح میں ہزوارش کہتے ہیں،

ہزوارش کے لغوی معنی گزارش اور شرح کے ہیں، لیکن اصطلاحاً اس کے معنی مخصوص ہیں، پہلوی زبان میں ایسے بہت سے سامی الفاظ ہیں، جو اس کی ایک شاخ آرامی سے تعلق رکھتے ہیں، اس طرح کے الفاظ کی کتابت تو آرامی تلفظ کے اعتبار سے ہوتی ہے، لیکن پڑھتے وقت اس کا متبادل پہلوی لفظ پڑھا جاتا ہے، مثلاً جلتا لکھتے ہیں، اور پوست پڑھتے ہیں، ملکا لکھتے ہیں، اور شاہ پڑھتے ہیں، اب لکھتے ہیں، اور پیت پڑھتے ہیں، اخ لکھتے ہیں اور برات پڑھتے ہیں، واضح ہو کہ یہ سامی کلمات عربی سے مشابہ ہیں، جلتا جلد ہے، ملکا ملک ہے، اور اب اور اخ تو دونوں زبانوں میں یکساں ہیں،

فارسی کے فرہنگ نویس خواہ وہ ایرانی ہوں یا ہندوستانی، قدیم ایران کی تاریخ اور وہاں کی زبانوں سے کما حقہ واقفیت نہیں رکھتے تھے، اسی کا نتیجہ ہے کہ اُن کے اس سلسلے کے اکثر بیانات غلط ہیں، ہزوارش کے تصور سے وہ لوگ یکسر ناواقف تھے، جہاں تک معلوم ہے فارسی فرہنگ نویسوں میں صاحبِ فرہنگ جہانگیری اس غلط فہمی کا شکار ہوئے، پروفیسر نذیر احمد نے اپنے مقالے برہان قاطع میں اس پر مفصل بحث کی ہے[1]، انھوں نے لکھا ہے کہ جمال الدین حسین انجوے شیرازی کو ایک قدیم کتاب کے اوراق[2] نے گمراہی میں مبتلا کر دیا، جو کسی زردشتی کے پاس تھی، اُس نے اس کتاب کے تمام لفظوں کو جو درحقیقت ہزوارش تھے، زند و پازند کے لفظ قرار دے کر اپنی فرہنگ میں شامل کر لیا، انجوے شیرازی کی پیروی میں محمد حسین بن خلف تبریزی صاحب برہان قاطع نے ان ہزوارش شکلوں کو زند و پازند کے لفظ قرار دیتے ہوئے اپنی فرہنگ میں حروفِ تہجی کے اعتبار سے فارسی کے اصیل لفظوں کے شانہ بشانہ کھڑا کر دیا، حالانکہ انجوے شیرازی نے اتنی احتیاط برتی تھی کہ ان الفاظ کو اس نے ایک الگ فصل

---

[1] مجلۂ علوم اسلامیہ، مسلم یونیورسٹی علی گڑھ، جون، دسمبر ۱۹۶۹ء، ص ۱۰۔

[2] جلد ا ص ۹۶ ذیل لغت آذر

میں درج کیا تھا، اس سے ظاہر تھا کہ اگرچہ وہ اُن کو زند و پازند کے الفاظ سمجھتا تھا، لیکن اُن کی اصل سے ناواقفیت کی بنا پر ان کو فارسی کا اصل لفظ قرار دینے میں تامل تھا کیونکہ ان کی عجیب و غریب شکلیں فارسی الفاظ کے ڈھانچے میں ٹھیک نہیں اترتی تھیں، مگر خلف تبریزی نے بغیر کسی جرح و تعدیل کے ان تمام ہزوارش شکلوں کو فارسی کے اصل لفظ قرار دیا، اور اس طرح فارسی زبان کی روح کو سخت صدمہ پہونچایا۔ پروفیسر نذیر احمد نے چونکہ اس سلسلے کے سارے الفاظ اپنے مضمون میں جمع کر دیئے ہیں، اس لیے اس کی تفصیل کی ضرورت نہیں۔

سراج الدین علی خان آرزو بارہویں صدی میں فارسی زبان و ادب کے جید عالم تھے، وہ پہلے شخص ہیں جنھوں نے اس بات کا فیصلہ کیا کہ فارسی اور کتابی ہندی (سنسکرت) کے توافق اور وحدت کا راز معلوم کیا جائے، اس کو وہ توافق لسانین کے نام سے اپنی مشہور مگر غیر مطبوعہ کتاب مثمر میں یاد کرتے ہیں۔ یہ نظریہ بعد میں تمام مشرق و مغرب کے علمار کی تحقیق کی بنیاد بنا، لیکن یہ بات قابل ذکر ہے کہ آرزو کا قدیم ایران کا مطالعہ ناقص تھا ہی، وجہ ہے کہ اوستا اور زند و پازند وغیرہ کے بارے میں ان کی تشریح ناقص اور ان کا بیان غلط فہمی پر مبنی ہے، یہاں تک کہ زرتشت جو مجوسیوں کا پیغمبر ہے، اس کے بارے میں ان کے بیانات غلط اور یکطرفہ ہیں، اسی طرح ہزوارش کے بارے میں بھی ان کو کوئی اطلاع نہ تھی، انھوں نے فرہنگ جہانگیری اور برہان قاطع کی پیروی میں ان کو زند و پازند کا لفظ قرار دے کر اپنی متذکرۂ بالا کتاب مثمر میں وہی سب باتیں دہرائی ہیں، جو پہلے حسین انجوے شیرازی، اور حسین تبریزی اپنی اپنی فرہنگوں میں بیان کر چکے تھے، غیر مناسب نہ ہوگا۔ اگر پہلے قدیم ایران کے متعلق ان کے وہ بیانات پیش کیے جائیں جو غلط ہیں، اس کے بعد ان کے ان تمام ہزوارش کی فہرست درج کی جائے،

گیومرت۔ مرکب است از گیو بکاف فارسی قلب بعض گوی و مرث مبدل مرد بمعنی مردگان

ان کا استدلال غلط ہے، گیومرت دو کلمے سے بنا ہے، گیو معنی (زندگی) اور مرتن یعنی مردنی و درگذشتنی یعنی (مرنے اور گذر جانے والا) و مردم۔ پس اس کے معنی ہوئے زندگی مردم یا زندگی جو فانی ہے[۱]، دراصل گیو معنی جان و زندگی اور مرتن صفت ہے، یعنی وہ چیز جو مرنے والی اور گذر جانے والی ہو۔ چونکہ آدمی فانی ہے، اس لیے اسے گیومرت کہا گیا ہے

(۲) قیاس می خواہد کہ زرادشت اصل باشد و معنی آن دشمن زراست درین صورت لقب او خواہد بود و ابراہام نامش۔

دراصل کلمہ زرتشت دو جزو پر مشتمل ہے زَرَتہ و اُشترہ یعنی دارندہ شتر زرد[۲]، بعض لوگوں نے آرزو کی طرح زرتشت کو ابراہیم بتایا ہے، اور اس کی کتاب اوستا کو صحفِ ابراہیم قرار دیا ہے، یہ بیان غلط ہے۔ نہ تاریخ سے اس کا ثبوت ملتا ہے اور نہ لغت سے اس کی تائید ہوتی ہے، اس لیے ابراہیم اور ابراہام دراصل سُریانی لفظ ہیں اور زرتشت آریائی، آریائی اور سریانی کا یہ جوڑ ناممکن ہے۔

(۳) نظیر این حال کتاب اوستا است کہ ابراہیم زردشت آنرا آوردہ و چون آن را نہ فہمیدند شرح بر آن نوشت موسوم بزند و چون آنرا ہم نہ فہمیدند شرح آن را نیز نوشت مسمی بہ پازند و عجب از وی چہ او دعوی پیغمبری داشت و پیغمبر بزبان قوم حرف می زند تا بفہمند و از آوردن کتابی کہ قوم آنرا نہ فہمند چہ حاصل[۳]

---

[۱] اس سلسلے کی بحث کے لیے دیکھیے برہان قاطع ج ۳ ص ۱۰۷۲ حاشیہ۔ نیز دیکھیے پورداؤد یشتہا ج۔ ج ۲ ص ۱۴۰۴۔

[۲] اس سلسلے کی مفصل بحث ڈاکٹر معین کی کتاب مزدیسنا و تاثیر آن در ادبیات فارسی ص ۶۲، ۶۳ پر ملتی ہے۔

[۳] رک ۱ ص ۸۰

(اس کی مثال کتاب اوستا ہے، جو ابراہیم زردشت کی لائی ہوئی ہے، اور چونکہ قوم نے اس کو نہ سمجھا تو اس نے زند کے نام سے اس کی شرح لکھی، جب لوگوں نے اسے بھی نہ سمجھا تو اس نے پازند نام سے اس کی شرح کی، اس کی یہ بات حیرت انگیز ہے کہ وہ دعوی پیغمبری کرتا تھا، اور پیغمبر اپنی قوم کی زبان میں گفتگو کرتے ہیں تاکہ لوگ اس کی بات سمجھ سکیں، ایسی کتاب لانے سے کیا فائدہ جس کو قوم نہ سمجھ سکے)

یہ قول اغلاط کا مجموعہ ہے، آرزو قدیم ایران کے مسائل سے واقف نہ تھے اس لیے اور دوسرے مصنفین کی طرح وہ ان غلطیوں سے محفوظ نہ رہ سکے اس سلسلے کی تفصیل درج ذیل ہے،

(۱) زردشت کا نام ابراہیم نہیں ہو سکتا، اس سلسلے کی بات اوپر آچکی ہے۔

(۲) اوستا کی شرح کا نام زند نہ تھا، بلکہ زند اوستا کی وہ شرح ہے جو پہلوی زبان میں لکھی گئی۔

(۳) زند کا مصنف زردشت قرار دیا گیا، یہ صحیح نہیں ہے، اوستا کی شرح پہلوی زبان میں دور ساسانی میں لکھی گئی، جو زردشت سے ہزاروں سال بعد کا دور ہے،

(۴) پازند زند کی مخصوص شرح بتائی گئی ہے یہ بھی صحیح نہیں ہے، دراصل زندگی وہ روایت جس میں ہزوارش کے بجائے اصل فارسی لفظ لکھ دیے گئے ہوں، پازند کہلاتی ہے، اور اسلامی دور کی یادگار ہے، زردشت کے زمانے کے ہزار سال بعد وجود میں آئی۔

(۵) اوستا، زند، پازند زردشت کی تصانیف قرار دی گئی ہیں، نہ اوستا زردشت کی تصنیف ہے، نہ زند و پازند، دراصل زردشت کے مذہب میں یہ آسمانی کتاب سمجھی گئی ہے، لہذا اصولی طور پر اس کو زردشت کی کتاب قرار دینے میں احتیاط برتنی چاہئے۔

زند کوئی تصنیف ہے اور نہ یہ زردشت کی لکھی ہوئی ہے، بلکہ اس کے سیکڑوں سال بعد وجود میں آئی، یہی حال پازند کا بھی ہے۔

(۶) متذکرہ بیان سے ظاہر ہے کہ اوستا، زند، پازند ایک ہی زبان ہے، دراصل ایک متن ہے، اور باقی دو شرحیں لیکن واقعہ ایسا ہے کہ اوستا کی زبان زند اور پازند کی زبان سے کوئی تعلق نہیں رکھتی، تینوں کی زبانوں میں بہت زیادہ تفاوت بھی ہے،

اس تفصیل سے واضح ہے کہ آرزو قدیم ایران کے صحایف اور السنہ کے بارے میں کس طرح کی غلط فہمی کے شکار تھے،

ذیل میں ہزوارش الفاظ کی بحث پیش کی جاتی ہے، اول مثمر سے آرزو کا قول نقل کیا گیا، پھر برہان قاطع کی عبارت نقل ہوگی، آخر میں اس کے ہزوارش کی نشان دہی کی جائیگی

(۱) مترا کہ در زبان پہلوی بمعنی باران است و در عربی مطر بطای دسند دارد۔

برہان قاطع۔ مترا بلغت زند و پازند باران را گویند و بہ عربی مطر خوانند (۱۹۷۵)

دراصل اس کے معنی باران نہیں بلکہ یہ باران کا ہزوارش ہے، پہلوی میں مترا لفظ کا کوئی وجود نہیں، یہ محض باران کے لکھنے کی شکل ہے، پہلوی میں لفظ باران محض ہزوارش کے طور پر آیا ہے۔

(۲) میا بفتح میم و تحتانی بمعنی آب کہ بعربی ماء گویند

اس کے معنی آب نہیں، بلکہ یہ آب کا ہزوارش ہے۔ پہلوی میں میا لفظ کا کوئی وجود نہیں، یہ محض آب کے لکھنے کی شکل ہے، پہلوی میں لفظ آب محض ہزوارش کے طور پر آیا ہے۔

(۳) نیرا۔ بکسر بمعنی آتش کہ بعربی نار گویند و غریب تر آنکہ نار در زبان ہندی کشمیری کہ مصداق دعوہ فان شیطانہ تیکلم بالہندیہ باشد آتش را نار گویند و وجہ آن بخاطر رسیدہ

لیکن بسبب وقت چون کم کسی خواہد فہمید نوشتہ، باآنکہ در الفاظ دیگر مطلقاً اشتراک نیست۔

برہان قاطع بلغت زند و پازند آتش را نار گویند و بعربی نار خوانند (۲۲۲۴)

نار اس کے معنی نہیں، بلکہ یہ نار کا ہزوارش ہے، پہلوی میں نیر الفظ کا کوئی وجود نہیں، یہ نار کے لکھنے کی شکل ہے، پہلوی میں لفظ نار محض ہزوارش کے طور پر آیا ہے۔

(۴) لیلیا۔ بمعنی شب کہ در عربی بمعنی لیل خوانند

برہان قاطع بلغت زند و پازند بمعنی شب است کہ عربان لیل را گویند (۱۹۲۲)

شب اس کے معنی نہیں بلکہ یہ شب کا ہزوارش ہے، پہلوی میں۔ لیلیا لفظ کا کوئی وجود نہیں، یہ شب کے لکھنے کی شکل ہے، پہلوی میں لفظ شب محض ہزوارش کے طور پر آیا ہے۔

(۵) تینا۔ بفوقانی بوزن مینا گل کہ بعربی طین گویند

برہان قاطع۔ بلغت زند و پازند گل را گویند و بعربی طین خوانند (۵۴۰)

دراصل گل اس کے معنی نہیں بلکہ یہ گل کا ہزوارش ہے۔ پہلوی میں تینا لفظ کا کوئی وجود نہیں، یہ محض گل کے لکھنے کی شکل ہے۔ پہلوی میں لفظ گل محض ہزوارش کے طور پر آیا ہے۔

(۶) تین، بفوقانی بمعنی انجیر کہ در عربی تین است

برہان قاطع۔ بلغت زند و پازند انجیر را گویند و در عربی نیز ہمین نام دارد (۵۴۰)

واضح ہے کہ عربی اور آرامی میں یہ لفظ مشترک ہے، ہزوارش آرامی سے لیا گیا ہے نہ کہ عربی سے۔ تین کے معنی دراصل انجیر نہیں بلکہ یہ انجیر کا ہزوارش ہے۔ پہلوی میں تین لفظ کا کوئی وجود نہیں، یہ محض انجیر کے لکھنے کی شکل ہے، پہلوی میں لفظ انجیر محض ہزوارش

کے طور پر آیا ہے۔

(۷) توپا۔ بفوقانی بواو معروف و باء فارسی بمعنی سیب کہ بعربی تفاح است۔

برہان قاطع۔ بلغت زند و پازند سیب را گویند (۵۲۶) عربی میں سیب کو تفاح کہتے ہیں۔ گویا توپا اور تفاح کا مادہ مشترک ہے۔

دراصل توپا کے معنی سیب نہیں بلکہ یہ سیب کا ہزوارش ہے، پہلوی میں توپا لفظ کا کوئی وجود نہیں، یہ محض سیب کے لکھنے کی شکل ہے پہلوی میں لفظ سیب محض ہزوارش کے طور پر آیا ہے،

(۸) توم۔ بفوقانی بوزن بوم بمعنی سیر کہ برادر پیاز است و بعربی ثوم وفوم بثاء مثلثہ وفا خوانند

برہان قاطع۔ توما بلغت زند و پازند سیر برادر پیاز را گویند و بعربی توم وفوم خوانند (ص ۵۳۵)

دراصل سیر اس کے معنی نہیں بلکہ یہ سیر کا ہزوارش ہے، پہلوی میں توم لفظ کا کوئی وجود نہیں، یہ محض سیر کے لکھنے کی شکل ہے، پہلوی میں لفظ سیر محض ہزوارش کے طور پر آیا ہے

(۹) سنت۔ بسین مہملہ و نون ہر دو متحرک بمعنی سال و سنتان جمع آنست و بعربی سنہ گویند۔

برہان قاطع۔ بلغت زند و پازند سال است (یا سالہا) و بعربی سنن خوانند (۱۳۰۰) ان ہزوارش الفاظ کی اصل آرامی لفظ "شنۃ" (Shanata) ہے جو عربی میں سنہ باسین غیر منقوطہ آیا ہے۔

دراصل سال اس کے معنی نہیں بلکہ یہ سال کا ہزوارش ہے۔ پہلوی میں سنت لفظ

کا کوئی وجود نہیں، یہ محض سال کے لکھنے کی شکل ہے۔ پہلوی میں لفظ سال محض ہزوارش
کے طور پر آیا ہے۔

(۱۰) بتمن :- بکسر بای موحدہ و نون ساکن و فتح فوقانی و میم مفتوح و نون بمعنی
دختر کہ بعربی۔ بنت گویند۔

در اصل دختر اس کے معنی نہیں، بلکہ یہ دختر کا ہزوارش ہے۔ پہلوی مین لفظ
بتمن کا کوئی وجود نہیں، یہ محض دختر کے لکھنے کی شکل ہے۔ پہلوی میں لفظ دختر محض
ہزوارش کے طور پر آیا ہے۔

(۱۱) بنمن :- بہمان حروف و اعراب بدون فوقانی بمعنی پسر کہ بعربی ابن گویند
برہان قاطع۔ بلغت زند و پازند پسر را گویند (ص ۳۱۰) بظاہر ابن عربی
کا ہم رشتہ ہے۔

در اصل پسر اسکے معنی نہیں بلکہ یہ پسر کا ہزوارش ہے، پہلوی مین لفظ بنمن کا کوئی
وجود نہیں یہ محض پسر کے لکھنے کی شکل ہے۔ پہلوی میں لفظ پسر محض ہزوارش کے طور پر
آیا ہے۔

(۱۲) شمیا :- بفتح سین معجمہ بمعنی آسمان کہ بعربی سماست

در اصل آسمان اس کے معنی نہیں۔ بلکہ یہ آسمان کا ہزوارش ہے۔ پہلوی میں
لفظ شمیا کا کوئی وجود نہیں، یہ محض آسمان کے لکھنے کی شکل ہے۔ پہلوی میں لفظ آسمان
محض ہزوارش کے طور پر آیا ہے۔

(۱۳) دمیا :- بفتح دال و سکون میم و تحتانی بالف کشیدہ بمعنی خون کہ بعربی
دم است۔

برہان قاطع۔ بلغت زند و پازند خون را گویند و بعربی دم خوانند (۸۸۱)

در اصل خون اس کے معنی نہیں بلکہ یہ خون کا ہزوارش ہے۔ لفظ دمیا کا پہلوی میں
کوئی وجود نہیں۔ یہ محض خون کے لکھنے کی شکل ہے پہلوی میں لفظ خون محض ہزوارش کے طور پر
آیا ہے۔

(۱۴) دما۔ بکسر اول بمعنی دود و دخانہ کہ در عربی دما بر وزن فعلا است بمعنی آب
برہان قاطع۔ بلغت زند و پازند دود و دخانہ گویند (۸۰۰)
ڈاکٹر معین کا خیال ہے کہ یہ لفظ ہزوارش شکل نہیں بلکہ دساتیر جو جعلی کتاب ہے،
اس سے ماخوذ ہے۔ (فرہنگ دساتیر ۲۴۵)

(۱۵) ملکا۔ بمعنی شاہ کہ بعربی ملک گویند۔
برہان قاطع۔ بلغت زند و پازند پادشاہ را گویند (۲۰۴۲)

در اصل پادشاہ اس کے معنی نہیں یہ بادشاہ کا ہزوارش ہے۔ لفظ ملکا کا پہلوی میں
کوئی وجود نہیں یہ محض پادشاہ کے لکھنے کی شکل ہے۔ پہلوی میں لفظ پادشاہ محض ہزوارش
کے طور پر آیا ہے۔

(۱۶) مشمشا :- بمعنی زردآلو کہ بعربی مشمش گویند۔
برہان قاطع۔ بلغت زند و پازند نوعی از زردآلو باشد (۲۰۱۷)

در اصل زردآلو اس کے معنی نہیں، بلکہ یہ ۔ ۔ ۔ ۔ زردآلو کا ہزوارش ہے، لفظ
مشمشا کا پہلوی میں کوئی وجود نہیں۔ یہ محض زردآلو کے لکھنے کی شکل ہے پہلوی میں لفظ
زردآلو محض ہزوارش کے طور پر آیا ہے۔

(۱۷) کلبا، کہ بعربی کلب است

برہان قاطع۔ بلغت زند و پازند بمعنی سگ باشد و بتازی کلب خوانند (۱۶۷۲)

دراصل سگ اس کے معنی نہیں بلکہ یہ سگ کا ہزوارش ہے۔ لفظ کلبا کا پہلوی میں کوئی وجود نہیں۔ یہ محض سگ کے لکھنے کی شکل ہے۔ پہلوی میں لفظ سگ محض ہزوارش کے طور پر آیا ہے۔

(۱۸) جلتا :- بفتح بمعنی پوست کہ بعربی جلد است۔

برہان قاطع بلغت زند و پازند پوست آدمی و حیوانات دیگر باشد و بعربی جلد گویند (۸۱)

دراصل پوست اس کے معنی نہیں بلکہ یہ پوست کا ہزوارش ہے۔ پہلوی میں جلتا کا کوئی وجود نہیں، یہ محض پوست کے لکھنے کی شکل ہے۔ پہلوی میں لفظ پوست محض ہزوارش کے طور پر آیا ہے۔

(۱۹) ذکرا :- بمعنی نر کہ بعربی بعینہ ہمین است و ازیں دریافت می شود کہ سابق درفارسی ذال معجمہ بود و حال مطلق نیست چنانکہ بر محاورہ آن پوشیدہ نیست و این مخالف تحقیق سابق است و ظاہر آنہم بزاء معجمہ است نہ ذال معجمہ

برہان قاطع۔ بلغت زند و پازند بمعنی نر باشد کہ در مقابل مادہ است و بعربی نیز ہمین معنی دارد، واضح ہے کہ یہ اتفاق کی بات نہیں بلکہ بعض سامی زبانوں میں یہ لفظ اس معنی میں آتا ہے، اور یہ ہزوارش سامی الاصل ہے۔

دراصل نر اس کے معنی نہیں بلکہ یہ نر کا ہزوارش ہے۔ پہلوی میں ذکر کا کوئی وجود نہیں یہ محض نر لکھنے کی شکل ہے۔ پہلوی میں لفظ نر محض ہزوارش کے طور پر آیا ہے۔

(۲۰) مزیا :- بفتح میم و سکون زاء معجمہ تحتانی بالف کشیدہ بمعنی ترازو کہ بعربی میزان گویند۔

برہان قاطع۔ در برہان مرقوم است۔ بلغت زند و پازند بمعنی ترازو باشد و بعربی میزان گویند (۲۰۰۲)

دراصل ترازو اس کے معنی نہیں، بلکہ یہ ترازو کا ہزوارش ہے، پہلوی میں مزیا کا کوئی وجود نہیں، یہ محض ترازو لکھنے کی شکل ہے پہلوی میں لفظ ترازو محض ہزوارش کے طور پر آیا ہے،

(۲۱) اسوریا :- بمعنی سوار کہ بعربی اسوار گویند۔

دراصل سوار اس کے معنی نہیں۔ بلکہ یہ سوار کا ہزوارش ہے، پہلوی میں اسوریا لفظ کا کوئی وجود نہیں، یہ محض سوار کے لکھنے کی شکل ہے، پہلوی میں لفظ سوار محض ہزوارش کے طور پر آیا ہے۔

(۲۲) بزدا :- بمعنی تخم کہ در عربی نیز بزر گویند۔

برہان قاطع۔ بلغت زند و پازند تخم زراعت را گویند (۲۷۲)

دراصل تخم اس کے معنی نہیں بلکہ یہ تخم کا ہزوارش ہے۔ پہلوی میں بزر لفظ کا کوئی وجود نہیں، یہ محض تخم کے لکھنے کی شکل ہے۔ پہلوی میں لفظ تخم محض ہزوارش کے طور پر آیا ہے۔

(۲۳) ورتا :- بواو فوقانی بمعنی گل کہ بعربی ورد است و ظاہرا ازہمین جہت ورد بمعنی گل، ائمہ عربی فارسی گفتہ اند چنانکہ امام سیوطی در مزہر آوردہ و در محل خود بیاید

برہان قاطع۔ بلغت زند و پازند گل را گویند و بعربی ورد خوانند (۲۲۹۴)

دراصل گل اس کے معنی نہیں بلکہ یہ گل کا ہزوارش ہے، پہلوی میں ورتا لفظ کا کوئی وجود نہیں، یہ محض گل کے لکھنے کی شکل ہے۔ پہلوی میں لفظ گل محض ہزوارش کے طور پر آیا ہے،

(۲۴) ارشیا :۔ بمعنی سریر کہ بعربی عرش گویند

برہان قاطع ۔ بلغت زند وپاژند تخت وادرنگ شہان را گویند (۱۰۵)

دراصل سریر اس کے معنی نہیں بلکہ یہ سریر کا ہزوارش ہے۔ لفظ ارشیا کا پہلوی میں کوئی وجود نہیں' یہ محض سریر کے لکھنے کی شکل ہے۔ پہلوی میں لفظ سریر محض ہزوارش کے طور پر آیا ہے۔

(۲۵) کذیا :۔ بکاف تازی وسکون ذال بمعنی دروغ کہ بعربی کذب باشد

برہان قاطع۔ بلغت زند وپاژند بمعنی دروغ باشد وبعربی کذب خوانند (۱۶۰۴)

دراصل دروغ اس کے معنی نہیں، بلکہ یہ دروغ کا ہزوارش ہے، لفظ کذیا کا پہلوی میں کوئی وجود نہیں، بلکہ یہ محض دروغ کے لکھنے کی شکل ہے۔ پہلوی میں لفظ دروغ محض ہزوارش کے طور پر آیا ہے۔

(۲۶) شجاری :۔ بفتح شین معجمہ وجیم تازی بالف کشیدہ وراء مہملہ بیا رکشیدہ بمعنی درخت کہ بعربی شجر خوانند

برہان قاطع۔ در برہان شجارا است ۔ بلغت زند وپاژند بمعنی درخت باشد کہ عربان شجر گویند (۱۲۵۴)

صاحب برہان کے خیال میں یہ نہ آیا کہ شجار الکا ریشہ اسی شجر میں ہے۔

دراصل درخت اس کے معنی نہیں، بلکہ یہ درخت کا ہزوارش ہے۔ لفظ شجاری کا پہلوی میں کوئی وجود نہیں، یہ محض درخت کے لکھنے کی شکل ہے۔ پہلوی میں لفظ درخت محض ہزوارش کے طور پر آیا ہے۔

(۲۷) پسلچل :۔ بکسر اول وفتح بار فارسی وجیم فارسی بمعنی ہی کہ میوہ است معروف

وبعربی سفرجل گویند۔

دراصل میوہ اس کے معنی نہیں بلکہ یہ میوہ کا ہزوارش ہے۔ لفظ پسلچل کا پہلوی میں کوئی وجود نہیں۔ یہ محض میوہ کے لکھنے کی شکل ہے، پہلوی میں میوہ محض ہزوارش کے طور پر آیا ہے،

(۲۸) شپتینا :۔ بفتح اول وسکون بار فارسی وفوقانی بیا رسیدہ ونون بالف کشیدہ

بمعنی لب کہ بعربی شفت گویند۔

دراصل لب اس کے معنی نہیں یہ لب کا ہزوارش ہے۔ لفظ شپتینا کا پہلوی میں کوئی وجود نہیں، یہ محض لب کے لکھنے کی شکل ہے۔ لب پہلوی میں محض ہزوارش کے طور پر آیا ہے۔

(۲۹) تبنا :۔ بفتح فوقانی وسکون باء موحدہ ونون بالف کشیدہ بمعنی کاہ کہ درعربی تبن گویند۔

برہان قاطع :۔ بلغت زند وپاژند کاہی کہ اندر گندم وجو بہم رسد (۴۶۸)

دراصل کاہ اس کے معنی نہیں۔ بلکہ یہ کاہ کا ہزوارش ہے۔ لفظ تبنا کا پہلوی میں کوئی وجود نہیں۔ یہ محض کاہ کے لکھنے کی شکل ہے۔ لفظ کاہ پہلوی میں ہزوارش کے طور پر آیا ہے۔

(۳۰) کالود — کالود بمعنی کالبد کہ بعربی قالب خوانند وبعضے از فضلا گفتہ اند کہ قالب بکسر لام نیز آمدہ لہذا شیخ شیراز قافیہ غالب آوردہ۔

گر یکی زیں چہار شد غالب   جان شیریں بر آید از قالب

دراصل کالبد اس کے معنی نہیں' یہ کالبد کا ہزوارش ہے۔ لفظ کالود کا پہلوی میں کوئی وجود نہیں' یہ صرف کالبد کے لکھنے کی شکل ہے۔ کالبد پہلوی میں محض ہزوارش کے طور پر آیا ہے۔

(۳۱) زابا :۔ بزای معجمہ بالف کشیدہ بمعنی تلا کہ متاخران طلا بتا نویسند در

عربی ذہب۔

دراصل تلا اس کے معنی نہیں۔ بلکہ یہ تلا کا ہزوارش ہے۔ لفظ زابا کا پہلوی میں کوئی وجود نہیں، یہ صرف تلا کے لکھنے کی شکل ہے۔ تلا پہلوی میں ہزوارش کے طور پر آیا ہے۔

(۳۲) اموتیا ا۔ بواو معروف و فوقانی مکسور و تحتانی بالف کشیدہ کنیز و پرستار کہ زن بود و بعربی امه خوانند۔

دراصل کنیز و پرستار اس کے معنی نہیں۔ بلکہ یہ کنیز و پرستار کا ہزوارش ہے، لفظ اموتیا کا پہلوی میں کوئی وجود نہیں۔ یہ صرف کنیز و پرستار کے لکھنے کی شکل ہے۔ کنیز و پرستار پہلوی مین ہزوارش کے طور پر آیا ہے۔

(۳۳) بیا ا۔ بہر دو بای موحدہ مفتوح در خانہ کہ بعربی باب گویند۔

برہان قاطع۔ بروزن سبا، در خانہ و در سرا را گویند (۲۳۱)

دراصل یہ پہلوی لفظ در کا ہزوارش ہے۔

(۳۴) مدینا ا۔ بمعنی شہر کہ بعربی مدینہ گویند۔

برہان قاطع۔ بلغت زند و پازند بمعنی شہر است و بعربی مدینہ گویند (۱۹۰۸)

دراصل یہ پہلوی لفظ شہر کا ہزوارش ہے۔

(۳۵) یدمن ا۔ بفتح تحتانی و سکون دال و کسر میم و نون بمعنی دست کہ بعربی ید

برہان قاطع۔ بلغت زند و پازند بمعنی دست دست کہ بعربی ید خوانند (۲۲۳۸)

دراصل دست اس کے معنی نہیں بلکہ یہ دست کا ہزوارش ہے۔ لفظ یدمن کا پہلوی میں کوئی وجود نہیں۔ یہ دست کے لکھنے کی شکل ہے۔ دست پہلوی میں ہزوارش کے طور پر آیا ہے۔

(۳۶) زک ا۔ بفتح زاء معجمہ و سکون کاف تازی بمعنی آن شک کہ بعربی زن است۔

برہان قاطع۔ بلغت زند و پازند، بمعنی آن باشد کہ کلمۂ اشارہ باشد (۱۰۳۵)

عربی ذاک، ذلک کا ہم ریشہ ہے۔

دراصل آن اس کے معنی نہیں، بلکہ یہ آن کا ہزوارش ہے، لفظ زک کا پہلوی میں کوئی وجود نہیں۔ بلکہ یہ آن کے لکھنے کی شکل ہے۔ آن پہلوی میں ہزوارش کے طور پر آیا ہے۔

(۳۷) سکینا ا۔ بوزن مدینا بمعنی کارد کہ بعربی سکّین بود بہ تشدید۔

دراصل کارد اس کے معنی نہیں، بلکہ یہ پہلوی لفظ کارد کا ہزوارش ہے۔

(۳۸) بیتا ا۔ بکسر خانہ کہ بعربی بیت است۔

برہان قاطع۔ بلغت زند و پازند بمعنی خانہ است کہ بعربی بیت خوانند (۳۳۱)

دراصل خانہ اس کے معنی نہیں۔ بلکہ یہ خانہ کا ہزوارش ہے۔ لفظ بیتا کا پہلوی مین کوئی وجود نہیں، بلکہ یہ خانہ کے لکھنے کی شکل ہے۔ خانہ پہلوی میں ہزوارش کے طور پر آیا ہے۔

(۳۹) بیل و بیلا ا۔ بکسر چاہ کہ بتازی بیر خوانند

برہان قاطع۔ بلغت زند و پازند بمعنی چاہ کہ بعربی بیر خوانند (۳۳۹)

دراصل چاہ اس کے معنی نہیں۔ بلکہ یہ چاہ کا ہزوارش ہے۔ لفظ بیل و بیلا کا پہلوی میں کوئی وجود نہیں۔ یہ چاہ کے لکھنے کی شکل ہے۔ لفظ چاہ پہلوی میں محض ہزوارش کے طور پر آیا ہے۔

مذکورۂ بالا تفصیلات سے خوب واضح ہوگیا کہ دراصل ہزوارش شکلوں کی اصلی قرأت جو عربی سے ملتی جلتی ہے، تمام تر غلط فہمی پر مبنی ہے۔ حقیقتاً وہ شکلیں حروف تہجی کے اعتبار سے پڑھنے کے لئے لکھی نہیں جاتی تھیں، بلکہ وہ پہلوی الفاظ کی مقررہ علامتوں کے طور پر سمجھی جاتی تھیں، اس سے یہ نتیجہ نکلا کہ ان کی اصلی قرأت سے فارسی کے لفظ نہیں بنتے بلکہ وہ آرامی کے الفاظ تھے، جو عربی کی طرح سریانی کی ایک شاخ ہے پس ان الفاظ سے یہ نتیجہ نکالنا کہ فارسی اور عربی میں الفاظ کی گہری مماثلت ہے غلط ہے۔ اور اسی طرح یہ نتیجہ بھی غلط ہوگا۔ کہ فارسی اور عربی میں توافقِ لسانین ہے۔

دار المصنفین کی نئی کتابیں

خریطۂ جواہر

مولانا شاہ معین الدین احمد ندوی مرحوم ناظم دار المصنفین کی یہ آخری تصنیف ہے، اس میں مرزا مظہر جان جاناں کی بیاض خریطۂ جواہر کے منتخب اشعار کی تشریح و ترجمہ کے ساتھ خود مصنف مرحوم کے اپنے خیالات بھی درج ہیں۔ ضخامت ۱۲۴ صفحے قیمت ۴-۷۵

ہندوستان کے مسلمان حکمرانوں کی مذہبی رواداری

اس میں عہد مغلیہ سے پہلے کے مسلمان حکمرانوں کی مذہبی رواداری کی تفصیلات درج ہیں۔

مرتبہ: سید صباح الدین عبدالرحمٰن، ضخامت ۱۶۰، قیمت ۵-۰۰

ہندوستان کی بزم رفتہ کی سچی کہانیاں حصہ دوم

اس میں ظہیر الدین بابر سے لیکر نورالدین جہانگیر سے متعلق دلچسپ اور سبق آموز کہانیاں ہیں،

مرتبہ سید صباح الدین عبدالرحمٰن، ضخامت ۰۰، صفحے، قیمت ۶ روپے ۲۵ پیسے۔

نیجر

جامع مسجد برہان پور کے کتبات

(بسلسلۂ معارف ماہ اپریل ۵۵ء)

تعمیر مسجد کا کتبہ

از جناب مولوی معین الدین صاحب ندوی استاد اردو فارسی سیواسدن کالج برہان پور،

جامع مسجد برہان پور میں فارقی دور کا دوسرا کتبہ منبر کے پاس کی وسطی محراب پر ہے، جسکی عبارت حسب ذیل ہے،

(۱) بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

(۲) وانّ المساجد للّٰہ فلا تدعوا مع اللّٰہ احداً الحمد للّٰہ الموفق للطاعات المعین۔

(۳) بفضلہ علی العبادات۔ والصلوٰۃ والسلام علی اشرف الخلق محمد الذی حرض العباد علی العبادۃ وعلی آلہ واصحابہ الذین قاموا۔

(۴) بواجبہا وزیادۃ۔ وبعد فان اولی ما ینفق فیہ شرائف الاحوال۔ القربات التی یعود نفعہا فی المآل۔ ومن اجل ذالک الصدقۃ الجاریۃ التی یدوم ثوابہا مدی الازمان ساریۃ۔ وقد وردت السنۃ۔ بان یصرفا

(۵) الاعتنۃ۔ ولانّ امر بنایۃ المساجد من شعار الدین وقع

المتمردین۔ لما یترتب من بناءھا مزید الثواب۔ وان بانیہا ملہم للصواب حیث ورد عنہ صلی اللہ علیہ وسلم انہ قال من بنی للہ مسجداً ولو کمفحص قطاۃ بنی اللہ لہ بیتاً فی الجنۃ فلذالک۔

(۶) امر مولانا السلطان الاعظم، والخاقان المکرم. الفائق بفضلہ علی سلاطین العرب والعجم۔ عادلشاہ بن مبارکشاہ الفاروقی خلد ملکہ ھذا المسجد الذی ھو بالوصف جدید۔ لانہ قل ان یوجد لہ نظیر۔ خالصاً لوجہہ۔

(۷) الکریم وطالباً لمرضاتہ الجسیم تقبل اللہ ذلک منہ بفضلہ ومزید کرمہ وطولہ۔ وکان ابتداؤہ سنۃ سبع وتسعین وتسعمایۃ واتمامہ سنۃ ــــ۔ خدم بکتبہ اقل عبید اللہ الداعی لہ ولدولتہ مصطفی بن نور محمد خطاط عفی اللہ عنہ۔

کتبہ کا ترجمہ :- میں اللہ کے نام سے شروع کرتا ہوں جو بڑا رحم کرنے والا اور بہت مہربان ہے ۔۔۔۔ اور بیشک مسجدیں اللہ (کی عبادت) کے لیے ہیں، پس تم اللہ کے ساتھ کسی کو مت پکارو۔ تمام تعریفیں اللہ کے لیے ہیں جو طاعتوں کی توفیق دینے والا اور اپنے فضل و کرم سے عبادتوں میں مدد دینے والا ہے، اور درود و سلام ہو اشرفِ خلق حضرت محمدؐ پر جنھوں نے (اللہ کے) بندوں کو عبادت کی ترغیب دی، اور آپ کے آل و اصحاب پر بھی (درود و سلام) ہو جنھوں نے (فرائض و) واجبات اور نوافل کی پابندی کی۔ حمد و صلوٰۃ کے بعد (معلوم ہو کہ) بیشک جن کاموں میں عمدہ قوتیں خرچ کی جاتی ہیں، ان میں سب سے بہتر وہ نیک کام ہیں جن کا فائدہ عقبیٰ میں بار بار ملتا ہے، اور اسی لیے وہ صدقہ جاریہ (کہلاتے) ہیں۔

کیونکہ ان کا ثواب زمانوں کی مدت تک یعنی قیامت تک جاری رہتا ہے، اس (صدقہ جاریہ) پر توجہ کرنے کے لیے حدیث بھی وارد ہوئی ہے، اور یہ بات بھی ہے کہ مسجد کی تعمیر کا کام دین کا امتیازی نشان اور نافرمانوں کی ذلت (کا سبب) ہے۔ کیونکہ ان کی تعمیر پر ثواب کثیر ملتا ہے، اور ان کے بانی کے دل میں خدا کی طرف سے حق بات ڈالی جاتی ہے؛ چنانچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ حدیث وارد ہوئی ہے، کہ آپؐ نے فرمایا کہ جو شخص اللہ کے لئے مسجد بنائے اگرچہ وہ قطاۃ پرندہ کے گھونسلے کی طرح (مختصر) ہو، اللہ اس کے لیے جنت میں گھر بنائے گا۔ پس اسی لیے ہمارے آقا سلطانِ اعظم، خاقانِ مکرم، از روئے فضل و کرم برتر از سلاطین عرب و عجم، عادل شاہ بن مبارک شاہ فاروقی نے اللہ ان کی حکومت کو ہمیشہ قائم رکھے، خداوند کریم کی خوشنودی کی نیک نیت رکھتے ہوئے، اور اس کی عظیم رضامندی کو طلب کرتے ہوئے اس مسجد (کی تعمیر) کا حکم دیا جو (مسجد) قابلِ تعریف ہے، کیونکہ اس کی نظیر کمیاب ہے، اللہ اس (مسجد) کو اس (بادشاہ) کی طرف سے اپنے فضل، مزید کرم اور احسان سے قبول فرمائے۔ اس کی (تعمیر کی) ابتدا ۹۹۷ سنہ (ہجری) میں ہوئی، اور اس کی تکمیل ــــ سنہ میں ہوئی۔ اس کتبہ کو تحریر کرنے کی خدمت اس (بادشاہ) کے کمترین غلام اور اس کی سلطنت کے دعاگو مصطفی بن نور محمد خطاط نے انجام دی۔ اللہ اس کے گناہ معاف کرے۔

کتبہ پر تبصرہ :- اس کتبہ کی زبان عربی اور رسم الخط خط ثلث ہے، عبارت نہایت خوشخط فصیح اور مقفیٰ ہے اسکی ایک امتیازی خصوصیت یہ ہے کہ اس کی زمین نقرئی اور حروف　　سیاہ ہیں۔ نقرئی زمین پر ابھرے ہوئے سیاہ حروف عجیب دلکش منظر پیش کرتے ہیں۔ یہ کتبہ سات سطروں پر مشتمل ہے، اس کی پہلی سطر جو محراب کے بالائی حصہ کے

تنگ زاویہ میں ہے، نہایت مختصر ہے، جس میں صرف "بسم اللہ الرحمن الرحیم" درج ہے، باقی سطریں محراب کی بتدریج بڑھتی ہوئی وسعت کے ساتھ طویل ہوتی گئی ہیں، اس کتبہ میں بھی وہی آیت اور وہی حدیث ہے جو دوسرے لسانی کتبہ میں ہے۔ حمد و نعت اور درود وسلام کے بعد صدقہ جاریہ کی فضیلت اور تعمیر مساجد کی اہمیت پر روشنی ڈالی گئی ہے، پھر بانی مسجد کا نام اور مسجد کی تعمیری شان کا ذکر کرنے کے بعد آغاز تعمیر کا سنہ لفظوں میں تحریر ہے، تکمیل کا سنہ ہندسوں میں درج کرنے کے لیے "واتمامہ سنۃ" کے اوپر جو خالی جگہ چھوڑی گئی تھی، وہ اب تک خالی ہے، سب سے آخر میں کاتب کا نام مصطفیٰ بن نور محمد خطاط درج ہے۔

سلاطین فاروقیہ کے ۲۲۵ سالہ دور حکومت میں صرف اسی کاتب کا نام تین کتبوں میں آیا ہے، اور وہ کتبے یہ ہیں، جامع مسجد برہان پور کی وسطی محراب کا کتبہ، جامع مسجد اسیر گڈھ کی وسطی محراب کا کتبہ اور حضرت شاہ منصورؒ کی مسجد واقع برہان پور کا کتبہ جو شمالی رخ کی دیوار پر نصب ہے، ان کتبوں کے سوا فاروقی دور کے کسی بھی کتبہ میں کسی بھی کاتب کا نام درج نہیں ہے۔

سنہ تکمیل کے سلسلہ میں غلط فہمی

جس طرح اس مسجد کے جنوبی مینار کے کتبہ میں لفظ "الہ آباد" سے بعض لوگ غلط فہمی میں مبتلا ہوئے[۱]۔ اسی طرح اس کتبہ میں "واتمامہ سنۃ" کے الفاظ سے بعض لوگوں کو یہ غلط فہمی ہوئی کہ یہ عظیم الشان مسجد صرف ایک سال میں مکمل ہوگئی۔ چنانچہ شری ہیرالال، جناب زوار حسین ایڈیٹر البرہان اور مسٹر رسل (Russel) کی یہی رائے ہے، زوار حسین صاحب مرحوم نے کتبۂ مذکورہ کا ترجمہ درج کرنے کے بعد تحریر کیا ہے کہ "ترجمۂ مذکورۂ بالا سے یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ مسجد کی اتنی بڑی سنگین اور عالی شان عمارت صرف ایک سال میں بنکر تیار ہوگئی۔ اس سے یہ نتیجہ نکالنا کچھ دشوار نہیں کہ اس زمانہ کے مسلمانوں کو دین کے کاموں سے کس قدر شغف تھا، سلطنت کے تمام کاروبار پر مسجد کے کاموں کو انھوں نے ترجیح دی ہوگی، اور سینکڑوں معمار، سنگ تراش اور ہزاروں مزدور لگائے گئے ہوں گے، تب کہیں اتنی مدت میں اتنا بڑا کام تیار ہوا"[۲]۔

یہ تینوں حضرات چونکہ عربی زبان کے قواعد اور اسلوب بیان سے ناواقف تھے اسلئے انھیں "اتمامہ سنۃ" کے الفاظ سے یہ غلط فہمی ہوئی کہ مسجد مذکور ایک سال میں مکمل ہوگئی۔ حالانکہ اگر اس فقرہ میں یہی مطلب ادا کرنا ہوتا تو سنۃ کے پہلے لفظ "فی" ضرور آتا۔ حقیقت یہ ہے کہ مسجد کی تکمیل کے پہلے ہی فاروقی سلطنت ختم ہوگئی۔ اس لیے کتبہ میں تکمیل کا سنہ درج نہیں ہوا۔ یہی رائے مسٹر کننگھام (Cunningham) کی ہے، چنانچہ اس نے ہندوستان کی تاریخی عمارتوں کا جائزہ لیکر ان پر جو رپورٹ شائع کی ہے اس میں تحریر کیا ہے کہ جامع مسجد برہان پور اکبر کے حملہ کی وجہ سے نامکمل رہ گئی[۳]۔

بعض احباب کا خیال ہے کہ مسجد مذکور ۱۰۰۲ھ میں مکمل ہوئی، جس کے ثبوت میں وہ کوثر پرنٹنگ پریس برہان پور کی مطبوعہ تاریخ برہان پور کا ایک قطعہ پیش کرکے کہتے ہیں کہ اس کے آخری مصرع میں جو دو تاریخی مادے ہیں، ان میں سے پہلا مادہ آغاز تعمیر کا ہے اور دوسرا تکمیل تعمیر کا۔ ان حضرات نے یہ فیصلہ کرتے وقت مصنف مرحوم کی اس عبارت پر غور کرنے کی زحمت گوارا نہیں کی جو اسی تاریخ برہان پور میں قطعہ سے پہلے بطور تمہید موجود ہے، اور جس سے واضح ہوتا ہے کہ دونوں تاریخی مادے ایک ہی سنہ

---

[۱] تفصیل کے لیے راقم کے مقالہ بعنوان "جامع مسجد برہان پور کے کتبات" مطبوعہ معارف بابت ماہ مارچ ۱۹۴۵ء کا ص ۲۰۴ ملاحظہ کیجیے۔

[۲] البرہان نمبر، ص ۹۴۔ [۳] E. I. P. S. for 1961-2

کے اور آغاز تعمیر کے ہیں۔ ذیل میں وہی تمہیدی عبارت مع قطعہ اس مستند تاریخ برہانپور سے درج کی جاتی ہے، جو مصنف کی زندگی ہی میں بڑی احتیاط کے ساتھ ۱۸۹۹ء میں مطبع مجتبائی دہلی سے شائع ہوئی تھی، اور اب کمیاب ہے۔

"تاریخ تکرر مشعر سال بنائے مسجد جامع بلدۂ برہان پور کی یہ ہے۔

بسلاطین جہاں بود وجودے کامل ۔۔۔ شاہ عادل خلف شاہ مبارک فاروق

مسجدے ساختہ از مال مزکی بیشک ۔۔۔ کہ زبان است بتوصیف وثنایش عاطل

خوش دو تاریخ خرد گفت دریں یک مصرع ۔۔۔ مسجد فیض بنا گشت بفیض عادل"

مذکورۂ بالا تمہیدی عبارت میں دو لفظ "تاریخ تکرر" اور "سال بنا" قابل غور ہیں جن سے واضح ہوتا ہے کہ اس قطعہ میں ایک ہی تاریخ دو مرتبہ کہی گئی ہے، اور وہ تاریخ سال بنا کی ہے، جس میں مسجد کا سنگ بنیاد رکھا گیا تھا، مصنف نے مزید احتیاط سے کام لیتے ہوئے دونوں تاریخی مادوں پر خط کھینچکر ہر ایک کے نیچے ۹۹۷ درج کر دیا ہے، جو مسجد کے آغاز تعمیر کا سنہ ہے۔ کوہ نور پرنٹنگ پریس کی مطبوعہ تاریخ برہانپور میں بھی یہ قطعہ مع تمہیدی عبارت موجود ہے، لیکن اس میں کسی بھی مادۂ تاریخ کے نیچے سنہ درج نہیں ہے۔

اس سلسلہ میں قاعدہ کلیہ یہ ہے کہ جب کسی شعر یا قطعہ میں ایک ہی سنہ کے دو یا زیادہ تاریخی مادے پیش کئے جاتے ہیں تو کسی وضاحت کی ضرورت نہیں ہوتی لیکن جب ان تاریخی مادوں کے سنہ مختلف ہوں تو شاعر کا یہ فرض ہوتا ہے کہ وہ اپنے شعر یا قطعہ میں اس کا اشارہ کر دے۔ ذیل میں دونوں صورتوں کی ایک ایک مثال درج ہے۔

ایک شاعر نے فرمانروائے دکن آصفجاہ ثانی نواب میر نظام علی خاں مرحوم کی تاریخ وفات کے قطعۂ ذیل کے ایک ہی مصرع میں ایک ہی سنہ کے دو تاریخی مادے پیش کئے[۵] تو اس نے کسی قسم کی وضاحت نہیں کی۔

بروح پاک میر نظام علی مدام ۔۔۔ خوانند با وضو ہمہ اشخاص فاتحہ

این مصرع عجیب دو تاریخ رانجواں ۔۔۔ متوجب بہشت و باخلاص فاتحہ

۱۲۱۸ ۱۲۱۹

لیکن جب دوسرے شاعر نے علامہ اقبال کی تاریخ وفات کے ایسے دو تاریخی مادے پیش کئے جن کے سنہ مختلف تھے تو اس نے یہ وضاحت کر دی کہ ان میں سے فلاں تاریخی مادہ ہجری سنہ کا ہے، اور فلاں عیسوی سنہ کا۔ ملاحظہ کیجئے۔

شمع خاموش سال ہجری ہے ۔۔۔ عیسوی شمع شاعری خاموش

۱۳۵۷ ۱۹۳۸

تاریخ برہانپور کے مذکورہ قطعہ میں اس بات کا ذرا سا بھی اشارہ نہیں ہے کہ ان میں سے ایک تاریخی مادہ آغاز تعمیر کا ہے اور دوسرا تکمیل تعمیر کا۔ اس سے بھی ثابت ہوتا ہے کہ یہ دونوں مادے ایک ہی سنہ کے ہیں، اس قطعہ میں شاعر کا مقصد صرف یہ تھا کہ وہ مسجد کے سال بنا کے سلسلہ میں ایک ہی مصرع میں ایک ہی سنہ کے ایسے دو تاریخی مادے پیش کر دے جن میں سے ایک میں مسجد کا وصف ہو اور دوسرے میں بانی مسجد کا۔ چنانچہ اس نے "مسجد فیض" سے اس روحانی فیض کو واضح کیا ہے۔ جو مسجد سے جاری ہے اور "بفیض عادل" سے بانی مسجد (عادل شاہ فاروقی) کی فیاضی کی طرف اشارہ کیا ہے۔

سنہ ۱۰۰۲ھ میں جامع مسجد برہان پور کے مکمل نہ ہونے کا ایک ثبوت یہ بھی ہے کہ

۵۔ تاریخ حیدرآباد حصہ دوم ص ۱۲۱

اس سنہ کے تقریباً بیس سال بعد بھی حضرت مجدد الف ثانیؒ کے خلیفہ حضرت میر محمد نعمان[1] نقشبندیؒ نے اسے نا مکمل فرمایا تھا، چنانچہ جناب منشی مطیع اللہ صاحب راشد برہان پوری نے میر محمد نعمانؒ کے ذکر میں تحریر کیا ہے کہ "خان خانان (عبد الرحیم خان) میر محمد نعمان نقشبندیؒ سے بہ اعتقادِ تمام ملتا تھا، انھیں اپنی محفلوں میں اور تقریبات کے موقع پر شریک رکھتا تھا، انہوں نے انکی خدمت میں گران قدر نذرانے پیش کیے لیکن انھوں نے کبھی کچھ قبول نہیں فرمایا۔ آخر ان سے التجا کی کہ میں عند اللہ کار خیر میں کچھ خرچ کرنا چاہتا ہوں برائے خدا مجھے مشورہ دیجیے۔ آپنے فرمایا کہ فاروقی سلطنت ختم ہو جانے سے جامع مسجد برہان پور کا جو بیرونی حصہ نا مکمل رہ گیا ہے۔ اس کی تکمیل کرا دو۔ خان خانان نے آپؒ کی نگرانی اور مشورہ سے احاطۂ جامع مسجد مشرقی اور جنوبی دروازے اور ہر سہ جانب پختہ اور وسیع حجروں کی قطاریں و سنگِ خارا کے ۲ دو وسیع حوض تعمیر کرا دیئے جو آج بھی اچھی حالت میں موجود و مستعمل ہیں۔[2]

---

[1] حضرت میر محمد نعمانؒ ۹۷۷ھ میں سمرقند میں پیدا ہوئے، جب یہ اپنی والدۂ ماجدہ کے شکم مبارک میں تھے امام اعظم حضرت ابو حنیفہؒ نے ان کے والدِ ماجد کے خواب میں آکر فرمایا تھا کہ تمھارے ہاں جو فرزند پیدا ہونے والا ہے اس کا نام میرے نام پر نعمان رکھنا چنانچہ ان کی ولادت پر ان کا نام میر محمد نعمان رکھا گیا موصوف نے سالہا سال تک حضرت مجدد الف ثانیؒ کی خدمت میں رہ کر فیوضات و کمالات باطنی حاصل کیے۔ اس کے بعد حضرت مجدد الفِ ثانیؒ نے انھیں طالبانِ حق کی ہدایت کے لیے برہانپور روانہ کیا، آپ کی ساری زندگی خلق خدا کو فیض پہنچانے میں گزری۔ مزار مبارک برہان پور میں ہے، آپ کے مرید حضرت خواجہ ہاشم کشمیؒ نے زبدۃ المقامات میں آپ کے حالات تفصیل سے لکھے ہیں۔

[2] برہان پور کے سندھی اولیا ص ۲۵۱۔

بہر حال ۱۰۰۲ھ میں جامع مسجد برہان پور کے مکمل نہ ہونے کے دلائل حسب ذیل ہیں:-

(۱) اگر یہ مسجد ۱۰۰۲ھ میں مکمل ہو جاتی تو فاروقی سلطنت جو اس کے بعد بھی سات سال تک قائم رہی کتبہ میں سنہ تکمیل درج کرنے کی غرض سے جو جگہ خالی رکھی گئی تھی، وہاں تکمیل کا سنہ ضرور کندہ کرا دیتی، اور یہ کام صرف چند منٹ کا تھا، کیونکہ کاتب کو صرف ۳ ہندسے اور ۲ صفر کندہ کرنے تھے،

(۲) مسٹر کننگھام کی رائے آپ پہلے ہی پڑھ چکے ہیں کہ فاروقی دور سلطنت میں یعنی ۱۰۰۹ھ تک مسجد مذکور مکمل نہیں ہوئی تھی۔

(۳) محکمۂ آثار قدیمہ نے بھی ۱۰۰۲ھ کو مسجد مذکور کا سنہ تکمیل ماننے سے صاف الفاظ میں انکار کیا ہے۔[1]

(۴) اگر یہ مسجد ۱۰۰۲ھ میں مکمل ہو جاتی تو اس کے تقریباً بیس سال بعد بھی حضرت میر محمد نعمانؒ اسے نا مکمل نہ فرماتے۔

(۵) بعض حضرات نے تاریخ برہانپور کے جس قطعہ کے جس تاریخی مادہ کو تاریخ تکمیل سمجھا ہے، مصنفِ تاریخ برہانپور نے اسی قطعہ کر اسی تاریخی مادہ کو آغاز تعمیر کی تاریخ مکرر کہا ہے، نہ کہ تاریخِ تکمیل۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جب عادل شاہ فاروقی نے ۹۹۰ھ سے ۹۹۷ھ تک تقریباً سات سال میں حضرت شاہ منصورؒ کی مسجد واقع برہان پور اسیر گڈھ کی عظیم جامع مسجد اور اسی اسیر گڈھ کی شاندار عید گاہ جیسی تین عالی شان عمارتیں تعمیر کرا لیں تو وہ ۹۹۷ھ سے ۱۰۰۵ھ تک اپنی زندگی کے آخری آٹھ سال میں بھی

---

[1] F.I.P.S. for 1961

برہان پور کی ایک جامع مسجد کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے میں کیوں قاصر رہا؟ اس کا جواب یہ ہے کہ اس کی زندگی کا یہ دور بڑا پرآشوب تھا۔ وہ سیاسی کشمکش اور جنگ و پیکار میں الجھا ہوا تھا۔ سیاسی الجھنیں تو مسجد کا سنگ بنیاد رکھنے کے پہلے ہی شروع ہو چکی تھیں جن میں بعد میں اور اضافہ ہو گیا تھا، چنانچہ ۹۹۴ھ میں جب شہنشاہ اکبر کے صوبے دار مالوہ خان اعظم مرزا عزیز کوکہ کی بیجا ضد کی وجہ سے تصادم کا موقع آگیا تو عادل شاہ فاروقی نے لشکر کشی کی۔ خان اعظم مقابلہ کی تاب نہ لاکر فرار ہو گیا۔ عادل شاہ نے گجرات تک اس کے لشکر کا تعاقب کر کے اسے اپنے بہنوئی عبدالرحیم خانِ خاناں صوبہ دار گجرات کی پناہ لینے پر مجبور کر دیا۔[۱] ۱۰۰۰ھ میں احمد نگر کی تخت نشینی کی جنگ میں اس نے برہان الملک کی حمایت میں جمال خاں دکنی سے سخت جنگ کر کے اسے شکستِ فاش دی اور برہان الملک کو احمد نگر کے تخت پر بٹھایا۔[۲] وہ ۱۰۰۳ھ میں شہزادہ مراد کے ساتھ احمد نگر کی مہم میں شریک رہا،[۳] اس کے بعد ۱۰۰۵ھ میں اکبر کی حمایت میں احمد نگر، گول کنڈہ اور بیجاپور کی ساٹھ ہزار فوج سے لڑتا ہوا اپنے ۳۵ نامی سرداروں اور بے شمار سپاہیوں کے ساتھ دکنیوں کے توپ خانہ کی زد میں آکر قتل ہو گیا۔[۴] ان ہی سیاسی الجھنوں اور جنگ و جدال کی مصروفیتوں کے ساتھ تعمیر مسجد کا کام بھی آہستہ آہستہ جاری رہا۔ اس لئے اس کی تکمیل میں تاخیر ہوتی رہی، اس کے بعد اس کا فرزند بہادر شاہ تخت نشین ہوا، اسے اپنے نام پہ بہادر پور آباد کر کے اسے دارالسلطنت بنانے اور وہاں جامع مسجد اور شاہی عمارتیں تعمیر کرنے کی دھن لگی ہوئی تھی، اس لیے وہ جامع مسجد برہانپور کی تکمیل پر توجہ نہیں کر سکا۔ اس کے علاوہ اس کا دور بھی

---

۱ ظفر الوالہ (عربی) جلد اول ص ۶۸ تا ۷۰، ۲ ایضاً ص ۷۱ تا ۷۴، ۳ ایضاً ص ۷۵ تا ۷۷
۴ دربار اکبری تقطیع خورد ص ۶۹۵

پرآشوب دور تھا، وہ تین سال بھی اطمینان سے حکومت نہیں کر پایا تھا کہ اکبر نے حملہ کر کے اسیر گڈھ کا محاصرہ کر لیا، اور طویل محاصرہ کے بعد اس کی سلطنت پر قبضہ کر لیا۔

بہر حال جامع مسجد برہان پور نہ بقول جناب نزوار حسین، شری ہیرالال اور مسٹر رسل ایک سال میں مکمل ہوئی نہ بقول بعض احباب پانچ سال میں یعنی ۱۰۰۳ھ میں بلکہ وہ آغاز تعمیر کے تقریباً ستائیس سال بعد شہنشاہ جہانگیر کے عہد سلطنت میں پایۂ تکمیل کو پہنچی، عادل شاہ فاروقی کی زندگی میں دونوں میناروں سمیت مسجد کی اندرونی عمارت اور ایک حوض تعمیر ہو چکا تھا، صحن کو پختہ بنانے کا موقع نہیں ملا تھا، اس لیے وہ بقول مصنف مآثرِ رحیمی بہت جلد خراب و خستہ ہو گیا تھا، تکمیل مسجد میں جو کمی رہ گئی تھی، وہ یہ تھی، صحن کا پختہ فرش، مسجد کا احاطہ، احاطہ میں طالبان علم دین اور عباد و زہاد کے لیے حجروں کی سہ طرفہ قطاریں، آمد و رفت کے لیے مسجد کے شایانِ شان بلند دروازہ، مزید ایک حوض اور حوضوں میں پانی مہیا کرنے کے لیے کنوئیں کی تعمیر۔ چونکہ اتنے کام باقی رہ گئے تھے، اس لئے کتبہ میں تکمیل کا سنہ درج نہیں کیا گیا، یہ سب کام ۱۰۲۴ھ میں نواب عبدالرحیم خانِ خاناں کے خرچ سے حضرت میر محمد نعمانؒ کی نگرانی میں انجام پا گئے۔ کنوئیں کی تعمیر کے بجائے لعل باغ سے ایک زمین دوز نہر جامع مسجد تک لائی گئی جس کا تاریخی نام "خیر جاری" (۱۰۲۴) ہے۔

جامع مسجد برہان پور کی وسطی محراب کے اس عربی کتبہ پر تبصرہ ہو چکا۔ اب برہانپور و اسیر گڈھ کی جامع مسجدوں کے سنسکرت کتبوں کا بعض لوگوں پہ جو ردِ عمل ہوا ہے اس کا جائزہ لینا ہے۔ ان لوگوں نے یہ غلط خیال قائم کر لیا تھا کہ دربار الٰہی میں جو نذرانۂ عقیدت سنسکرت زبان میں پیش کیا جائے گا، وہ یقیناً مشرکانہ جذبات کا حامل ہوگا۔

اسی غلط خیال کی بنا پر مسٹر بلاک نے ایک غلط نظریہ پیش کیا، اور جناب مولوی عبدالستار صاحب فاروقی نے اس پر حاشیہ آرائی کر کے سلاطینِ فاروقیہ پر بے بنیاد الزام عائد کیا۔ حالانکہ سب زبانیں خدا کی بنائی ہوئی ہیں۔ قرآن مجید میں ارشاد ہے، وَمِنْ اٰیَاتِہٖ اِخْتِلَافُ اَلْوَانِکُمْ وَاَلْسِنَتِکُمْ۔ یعنی خدا کی قدرت کی نشانیوں میں سے ایک نشانی یہ ہے کہ اس نے تمھارے رنگ اور تمھاری زبانیں الگ الگ بنائی ہیں، اگر سنسکرت مسلمانوں کی مذہبی زبان نہیں ہے تو اردو، فارسی، ترکی بھی مسلمانوں کی مذہبی زبانیں نہیں ہیں۔ اگر اردو و فارسی میں اسلامی خیالات کا اظہار جائز ہے تو سنسکرت میں بھی جائز ہے۔

مسٹر بلاک نے جامع مسجد اسیر گڈھ کے سنسکرت کتبہ کو دیکھ کر جو نظریہ پیش کیا تھا، اس کا خلاصہ یہ ہے کہ عادل شاہ فاروقی نے یہ مسجد اس لیے تعمیر کی تھی کہ مسلمان اس میں نماز پڑھیں اور ہندو پوجا کریں۔ اس لئے اس نظریہ کی تائید میں یہ دلیل پیش کی تھی، کہ سنسکرت کتبہ کا آغاز ہندوانہ دعائیہ کلمات سے ہوا ہے[1]۔ اس دلیل کی تردید راقم نے ماہنامۂ معارف کی ماہ ستمبر ۱۹۷۴ء کی اشاعت میں کر دی ہے۔ جس کا لب لباب یہ ہے کہ سنسکرت کتبہ کے جن ابتدائی جملوں پر اعتراض ہوا ہے، ان میں اوصافِ الٰہی کا وہ مضمون ادا ہوا ہے، جو قرآن و حدیث میں موجود ہے، سلطان عادل شاہ فاروقی قابل مبارکباد ہے، کہ اس نے اسلامی عقائد کو اپنی ہندو رعایا کی مذہبی زبان میں کندہ کرا کر انھیں خدا کے بارے میں اسلامی تصورات سے آگاہ کرایا ہے، اب رہا مسٹر بلاک کا یہ نظریہ کہ مسجد اس لیے تعمیر کی گئی تھی کہ مسلمان اسمیں نماز پڑھیں

[1] معارف بابت ماہ جون ۱۹۲۴ء عنوان "اسیر گڈھ کے کتبات"۔

اور ہندو پوجا کریں، اس کا جواب یہ ہے کہ برہانپور و اسیر گڈھ کی جامع مسجدوں کے عربی و سنسکرت کتبوں کے کسی بھی جملہ سے اس نظریہ کی تائید میں ذرا سا بھی اشارہ نہیں ملتا۔ اس کے برخلاف ان کتبوں کی داخلی شہادت اس نظریہ کی تردید کرتی ہے، ان دونوں مسجدوں میں عربی کے دو دو کتبے ہیں، ان چاروں کتبوں کا آغاز قرآن مجید کی اس مبارک آیت سے ہوا ہے، وان المساجد للہ فلا تدعوا مع اللہ احدا ۵ (یعنی بیشک سب مسجدیں اللہ کی عبادت) کے لیے ہیں، پس تم اللہ کے ساتھ کسی کو مت پکارو۔ صاحب تفسیر مظہری نے اس آیت کی تشریح میں تحریر کیا ہے کہ مسجدیں اللہ کے لیے مخصوص ہیں، اللہ کی عبادت میں دوسروں کو شریک قرار دینے کے لیے نہیں ہیں، پھر مزید وضاحت کرتے ہوئے لکھا ہے کہ "یہودی اور عیسائی عبادت خانوں میں جاکر عبادت الٰہی میں دوسروں کو شریک کرتے تھے اس پر اللہ نے مسلمانوں کو حکم دیا کہ وہ مسجدوں میں جائیں تو اپنی دعائیں خالص اللہ ہی سے کریں[1]" عادل شاہ فاروقی نے اس مبارک آیت کا انتخاب کر کے اسے ان چاروں کتبوں کی تحریر میں جو اولیت دی ہے، اس سے صاف ظاہر ہے کہ وہ ان مسجدوں کو غیر اللہ کی عبادت سے پاک رکھنا چاہتا تھا، اس کے علاوہ جامع مسجد اسیر گڈھ کی وسطی محراب کے کتبہ میں کلمۂ طیبہ کے علاوہ آیۃ الکرسی، سورۂ اخلاص، اور سورۂ کافرون بھی کندہ ہیں کلمۂ طیبہ اسلام کا بنیادی عقیدہ ہے، اس کے پہلے جزو میں یہ تعلیم دی گئی ہے کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں ہے، اس لئے اللہ کے سوا کسی کی عبادت کی اجازت نہیں ہے، آیۃ الکرسی اور سورۂ اخلاص میں توحید خالص کی تعلیم دیکر یہ واضح کیا گیا ہے، کہ خدا کی

[1] تفسیر مظہری، اردو، آخری جلد ص ۱۳۵۔

خدائی میں کوئی شریک نہیں ہے، سورۂ کافرون کا مضمون اسلامی عبادت کے ساتھ غیر اسلامی پرستش کی نفی کرتا ہے، ان سب دلائل سے مسٹر بلاک کے نظریہ کی تردید ہوتی ہے۔ آئیے اب ایک نظر سنسکرت کتبوں کی داخلی شہادت پر بھی ڈال لیں، جامع مسجد برہان پور کے سنسکرت کتبہ میں تعمیر مسجد کی غرض وغایت بتاتے ہوئے کہا گیا ہے،

(आदल शाह राज्ञा मसी तिरियं नि मिता न: स्व धर्म पाल नार्थं)

اس فقرہ کا آخری لفظ دو لفظوں پالن اور ارتھ سے مرکب ہے، ارتھ کے معنے ہیں غرض ومقصد، پالن کے ایک معنے ہیں، اصولوں کے مطابق عمل کرنا، اور دوسرے معنے ہیں حفاظت کرنا۔ پالن کے پہلے معنی کے اعتبار سے اس فقرہ کا مطلب یہ ہوا عادل شاہ بادشاہ نے اپنے مذہب کے اصولوں کے مطابق عمل کرنے کے لیے مسجد تعمیر کی۔ ظاہر ہے کہ بادشاہ کا مذہب اسلام تھا، اس لیے یہ مسجد اسلامی احکام پر عمل کرنے کے لیے ہی بنائی گئی تھی نہ کہ غیر اسلامی احکام کی بجاآوری کے لیے۔ دوسرے معنی کے اعتبار سے مطلب یہ ہوگا کہ سلطان عادل شاہ نے اپنے مذہب کی حفاظت کیلئے مسجد تعمیر کی۔ ضمن اس بات کیطرف اشارہ ہے کہ مسجد میں کسی ایسے کام یا ایسی عبادت کی اجازت نہیں ہے، جس سے اسلامی احکام محفوظ نہ رہیں۔

مسٹر بلاک کے نظریہ کا جواب ہو چکا۔ اب محترم مولوی عبدالستار صاحب فاروقی نے اپنے اس مقالہ میں جس کا عنوان "اسیر گڑھ کے کتبات"[1] ہے، اس نظریہ پر جو حاشیہ آرائی کی ہے وہ ان ہی کے الفاظ میں یہ ہے۔

"اس میں کوئی شک نہیں کہ فاروقی خاندان نے اکثر ہندوانہ مراسم وخیالات کو قبول کر لیا تھا،" یہ لوگ ہندو جوتشیوں کی بڑی قدر کرتے تھے، مسجد کا سنگ بنیاد

---

[1] مطبوعہ معارف بابت ماہ جون ۱۹۴۴ء

ایسے زمانہ میں رکھا گیا" جب کہ دکن میں ہندو ملمانی ہوا چل رہی تھی، اور آج تک اس قرب وجوار میں ایسے پیرزادے ہیں"

"جن سے ہر دو قوموں کو عقیدت وارادت ہے، اور وہ اوتاروں کو مانتے ہیں"

فاضل مقالہ نگار کا مذکورہ بیان چار فقروں پر مشتمل ہے، اور اس کا ایک ایک فقرہ غور طلب ہے۔ پہلے فقرہ میں بڑے وثوق کے ساتھ ارشاد ہوا ہے کہ "فاروقی خاندان نے اکثر ہندوانہ مراسم وخیالات کو قبول کر لیا تھا" دریافت طلب امر یہ ہے کہ وہ کونسے ہندوانہ مراسم وخیالات تھے، جو سلاطین فاروقیہ نے قبول کر لیے تھے، اور ان کا ثبوت آپ کے پاس کیا ہے؟ ہمیں تو کسی بھی تاریخ میں اس کا ادنیٰ سا بھی ثبوت نہیں ملا۔ نہ انھوں نے ہندوانہ لباس وطرز معاشرت اختیار کی نہ ہندوؤں کے تہوار منائے، نہ ان کے مذہبی عقائد قبول کئے نہ ان سے شادی بیاہ کے تعلقات قائم کئے شہنشاہ اکبر اور والی گولکنڈہ (ابو الحسن تانا شاہ کی طرح اپنے شاہی قلعوں میں مندر تعمیر کئے۔ اس کے برخلاف کتب تاریخ سے ان کی دین داری اور عقائد کی پختگی کے ثبوت ملتے ہیں۔ جناب مفتی مطیع اللہ صاحب راشد برہانپوری نے اپنی کتاب برہانپور کے سندھی اولیاء کے دیباچہ میں سلاطین فاروقیہ کی سیرت پر تبصرہ کرتے ہوئے تحریر کیا ہے کہ

"فاروقی سلاطین کی بابت یہ ظاہر کر دینا ضروری خیال کرتا ہوں کہ بانی سلطنت سے لے کر" خاتم سلطنت تک اس سلسلہ کے تمام بادشاہ راسخ العقیدہ سنی ہونے کے ساتھ ساتھ خود بھی" عالم وفاضل، درویش دوست اور صوفیانہ ذوق سے بہرہ ور تھے، اور علماء، صلحاء وصوفیاء" کی سرپرستی اور معارف نوازی میں ایک دوسرے پر تفوق رکھتے تھے، نیز ہر بادشاہ اپنے زمانہ" کے کسی نہ کسی خدا رسیدہ

بزرگ کی بیعت وخلافت سے فیضیاب تھا۔"

اذکارِ ابرار کے مصنف نے بھی عادل شاہ فاروقی بانی جامع مسجد برہان پور کو "درویش دوست اور ولی سرشت" تحریر کیا ہے (صفحہ ۴۵۸)

دراصل ہندوانہ مراسم وخیالات اکبر جیسے بادشاہوں نے قبول کر لئے تھے جس کے ثبوت تاریخ میں بکثرت موجود ہیں، نمونہ کے طور پر ایک ثبوت ملاحظہ ہو، جو مولانا محمد حسین آزاد نے شہنشاہ اکبر کے جشنِ نوروز کے سلسلہ میں تحریر کیا ہے۔

"روز جشن سے ایک دن پہلے مبارک ساعت شبھ لگن میں ایک سہاگن بی بی اپنے ہاتھ سے دال دلتی، اسے گنگا جل میں بھگوتی، میٹھی پیس کر رکھتی، جشن کی ساعت قریب آئی، بادشاہ اشنان کو گئے، رنگین جوڑا ساعت اور ستاروں کے موافق حاضر، جامہ پہنا، کھڑکی دار پگڑی راجپوتی انداز سے باندھی، مکٹ سر پر رکھا، کچھ اپنا خاندانی کچھ ہندوانی گہنا پہنا، جوتشی اور نجومی اصطرلاب لگائے بیٹھے ہیں، جشن کی ساعت آئی، برہمن نے ماتھے پر ٹیکا لگایا، جواہر نگار کنگن ہاتھ میں باندھا، کوٹلے دہک رہے ہیں، خوشبوئیاں تیار رہیں، ہون ہونے لگا، چوکے میں کڑھائی چڑھی ہے۔ یہاں اس میں بڑا پڑا ادھر بادشاہ نے تخت پر قدم رکھا، نقارۂ دولت پر چوب پڑی، نوبت خانہ میں نوبت بجنے لگی کہ گنبد گردوں گونج اٹھا۔"[۱]

ہندوانہ مراسم وخیالات قبول کرنے کا کیسا واضح ثبوت ہے۔ ایسا کوئی ثبوت برہان پور کے سلاطینِ فاروقیہ کے طویل دورِ حکومت میں کہیں نظر نہیں آتا۔

---

[۱] دربارِ اکبری تقطیع خورد ص ۱۶۶

فاروقی بادشاہوں پر مولانا عبدالستار فاروقی کا دوسرا اعتراض یہ ہے کہ "یہ لوگ ہندو جوتشیوں کی بڑی قدر کرتے تھے"، اس فقرہ میں کتنی پتہ کی بات کہی گئی ہے کہ سلاطین فاروقیہ نجوم کے معتقد تو تھے ہی، لیکن ان کے دربار میں مسلمان نجومیوں کے بجائے ہندو جوتشیوں کی بڑی قدر تھی۔ حالانکہ سوائے اس کے کہ ایک فاروقی بادشاہ کے ایک کتبہ میں مسجد کا سنگ بنیاد رکھنے کی مبارک ساعت کا ذکر ہے، کوئی ایسا ثبوت نہیں ملتا کہ اس خاندان کے بادشاہ نجوم یا جوتش کے قائل تھے۔ ممکن ہے کہ دیگر شاہان اسلام کی طرح سلاطینِ فاروقیہ بھی نجومیوں اور جوتشیوں کے قدرداں رہے ہوں، مگر ہندو جوتشیوں کی تخصیص کی نہ کوئی وجہ سمجھ میں آتی ہے، نہ مولانا نے اپنے دعوے کی تائید میں کوئی ثبوت پیش کیا ہے۔

نجوم کی شرعی حیثیت سے قطع نظر، اس زمانہ میں عام رجحان یہ تھا کہ کسی اہم کام کو انجام دینے کے لیے مبارک ساعت تلاش کی جاتی تھی، اسی لئے علم نجوم کی عام مقبولیت تھی، اور یہ علم شہزادوں اور امیر زادوں کے درس میں داخل تھا، نیز شاہی درباروں میں اس کی بڑی قدر تھی، چنانچہ مولانا محمد حسین آزاد نے اپنی کتاب دربارِ اکبری میں اس سلسلہ میں یہ تحریر کیا ہے کہ

"شاہان گزشتہ وامرائے سلف علوم کے ذیل میں علم اخلاق، تاریخ دانی، ہیئت، نجوم، رمل، شاعری، انشاء پردازی، خوش نویسی، مصوری، وغیرہ وغیرہ کو فنون کے اجزائے کامل سمجھ کر بڑی کوشش سے حاصل کرتے تھے، اور جو لوگ ان باتوں میں کمال رکھتے تھے ان کی عزت وتوقیر کرتے تھے، خود بھی ان باتوں میں کمال یا اچھی مداخلت پیدا کرتے تھے۔"[۱]

---

[۱] دربارِ اکبری تقطیع خورد ص ۶۲۵۔

تقریباً تمام مسلمان بادشاہوں، امیروں اور رئیسوں کو نجوم سے دلچسپی تھی اور وہ نجومیوں کے قدر داں اور معتقد تھے، جس کے ثبوت میں چند سلاطین و امراء کے واقعات بطور مثال پیش کئے جاتے ہیں۔

شہنشاہ اکبر ابھی آپ شہنشاہ اکبر کے حال میں پڑھ چکے ہیں کہ اس کے جشن نوروز کے سلسلہ میں جو بڑا تلا جاتا تھا، اس کے لیے دال بھی مبارک ساعت میں پیسی جاتی تھی، اس جشن کے موقع پر جو لباس پہنا جاتا تھا اس کے رنگ کا انتخاب بھی ساعت اور ستاروں کی مناسبت سے کیا جاتا تھا، تخت پر قدم رکھنے کی ساعت بتانے کے لیے نجومی اور جوتشی ہاتھ میں اصطرلاب لئے ہوئے دربار میں موجود رہتے تھے، نجومیوں اور جوتشیوں کی تجویز کردہ ساعت پر اکبر برہمن کے ہاتھ سے اپنے ماتھے پر ٹیکا لگواتا تھا۔

ہمایوں بادشاہ شہنشاہ اکبر کا باپ ہمایوں بھی نجوم کا معتقد تھا، اور خود بھی اس فن میں ماہر تھا، چنانچہ جب اس نے حمیدہ بانو سے نکاح کرنا چاہا تو خود اصطرلاب ہاتھ میں لیکر نکاح کی مبارک ساعت دریافت کی اور اس ساعت میں نکاح پڑھوایا۔[1]

شہزادی گلبدن بیگم اکبر کی پھوپھی گلبدن بیگم بھی نجومیوں کی معتقد تھی، چنانچہ اس نے اکبر کی ولادت کے سلسلہ میں لکھا ہے کہ

قمر در برج اسد بود، تولد برج ثابت شدہ، بنہایت خوب است و منجمان گفتند فرزندے کہ دریں ساعت شود صاحب اقبال و دراز عمری شود۔[2]

(اکبر کی ولادت کے وقت) قمر برج اسد میں تھا، اس برج میں ولادت ثابت ہو گئی۔ یہ بات نہایت اچھی ہے، نجومیوں نے کہا ہے کہ جو فرزند اس ساعت میں پیدا ہوتا ہے وہ صاحب اقبال اور عمر دراز ہوتا ہے۔

۱؎ و ۲؎ ہمایوں نامہ گلبدن بیگم ص ۹۸۔

سلطان محمد تغلق یہ بادشاہ عالم دین تھا۔ اور اسے ہدایہ کی چاروں جلدیں زبانی یاد تھیں اس کے باوجود وہ نجوم کا معتقد تھا، چنانچہ جب اس نے امرائے دکن کی بغاوت کے سلسلہ میں قلعۂ دولت آباد کا محاصرہ کرنا چاہا تو شاہی دربار کے نجومیوں نے آگاہ کر دیا کہ محاصرہ شروع کرنے کے لیے آج سے تین دن تک کوئی نیک ساعت نہیں ہے۔ اس لیے سلطان کے حکم کے مطابق شاہی فوج ان ایام میں بغیر کسی کارروائی کے قلعہ سے دور کھڑی رہی جب چوتھا دن نکلا تو اس نے منجنیقیں نصب کر کے سرنگ کھودنی شروع کی۔[1]

سلطان علاء الدین بہمنی جب ظفر خان نے سلطان محمد تغلق کا اقتدار حکومت ختم کر کے بہمنی سلطنت کی بنیاد رکھی تو برہمن جوتشیوں کی تجویز کردہ نیک ساعت پر تاج پوشی کی اور علاء الدین بہمنی کے لقب سے عنانِ حکومت ہاتھ میں لی،[2]

سلطان احمد شاہ بہمنی سلطان احمد شاہ بہمنی نے اپنے شہزادہ کی شادی والیِ برہان پور نصیر خاں کی شہزادی زینب سے بڑی دھوم دھام سے کی اور دلہن کو اپنے دار السلطنت احمد آباد بیدر لے گیا۔ چونکہ نجومیوں نے بتایا تھا کہ دولہا دلہن کے ملنے کی مبارک ساعت دو ماہ بعد آئے گی۔ اس لیے اس نے دلہن کو اس کی کنیزوں سمیت شہر کے باہر اس عالی شان بارہ دری میں ٹھہرایا جو ایک دلکش باغ میں تھی اور شہر کی آئین بندی کرا کر دو ماہ تک جشن مناتا رہا۔ پھر جب نجومیوں کی تجویز کردہ ساعت آئی تو دلہن کو شہر میں داخل کر کے دولہا سے ملایا۔[3]

اس طرح عروس و نوشاہ کو نجومیوں کی طے کردہ مبارک ساعت کے انتظار میں

۱؎ تاریخ فرشتہ اردو جلد اول ص ۳۴۲ ۲؎ ایضاً ص ۳۴۴ ۳؎ ایضاً ص ۴۰۱

دو ماہ تک ایک دوسرے سے جدا رہنا پڑا۔

صوبہ دار داؤد خان پنّی داؤد خان پنی اورنگ آباد کا صوبہ دار تھا۔ فرخ سیر کے فرمان کے مطابق اس کا تبادلہ احمد آباد (گجرات) کو ہوا تو وہ احمد آباد پہنچکر تین روز تک شہر کے باہر دریائے نربدا کے کنارے محمد بیگ خان نائب صوبہ دار کے مکان میں مقیم تھا اور چوتھے روز شہر میں داخل ہوا۔ کیونکہ نجومیوں کے فیصلہ کے مطابق شہر میں داخل ہونے کی مبارک ساعت تین روز کے بعد آنے والی تھی۔[1]

شہنشاہ شاہ جہان شاہجہاں نے دہلی کے قلعہ کی بنیاد مبارک ساعت میں رکھی تھی،[2]

شہنشاہ اورنگ زیب شہنشاہ اورنگ زیب جو شریعت کی پابندی میں ضرب المثل ہے، اسے ایام شہزادگی ہی سے نجوم سے دلچسپی تھی، اس کا مصاحب فاضل خاں علم نجوم کی رو سے پیشینگوئیاں لکھ کر اسے دیا کرتا تھا، جن میں سے اکثر صحیح ثابت ہوئیں۔ خصوصاً دکن کی مہم میں جو واقعہ بمقام خواص پور پیش آیا۔ اس کی پیشینگوئی وہ سالہا سال پہلے کر چکا تھا۔[3]

اورنگ زیب کی علم نجوم سے یہ دلچسپی بعد میں بھی باقی رہی، چنانچہ دارا شکوہ پر فتح حاصل کرنے کے بعد جب وہ دہلی کے باغ اعز آباد میں جو شالامار باغ کے نام سے مشہور ہے، لشکر سمیت مقیم تھا، نجومیوں نے تخت نشینی کی مبارک ساعت روز جمعہ یکم ذیقعدہ ۱۰۶۸ھ تجویز کی اور اتنا وقت نہیں تھا کہ سلطنت مغلیہ کے تاجدار ایسے موقع پر جس پیمانہ کی تیاری کرتے تھے، اس کا اہتمام ہو سکے۔ لہذا شہنشاہ اورنگ زیب نے اس خیال سے کہ نجومیوں کی طے کردہ ساعت سعید ٹل نہ جائے۔ اسی باغ میں وقت مقررہ پر سادگی کے ساتھ رسم تخت نشینی ادا کر لی۔[4]

---

[1] مراۃ احمدی فارسی جلد اول ص ۴۰۳ [2] معارف بابت ستمبر ۴۶ء ص ۱۸۳ [3] قاموس المشاہیر، جلد دوم ص ۱۱۶، ۱۱۷ [4] مآثر الامرا فارسی جلد سوم ص ۵۰۴، ۵۰۵، میر ابوالفضل معموری کے ذکر میں ضمناً۔

علم نجوم سے شاہان اسلام کے اس گہرے تعلق کو دیکھتے ہوئے، والی برہان پور سلطان عادل شاہ فاروقی نے جامع مسجد برہان پور کے سنسکرت کتبہ میں آغاز تعمیر کی جو مبارک ساعت درج کرائی ہے، وہ کوئی ایسی حرکت نہیں معلوم ہوتی جس کی بنا پر نہ صرف اسے بلکہ پورے فاروقی خاندان کو مطعون کیا جائے کیونکہ

ع:۔ این گناہیست کہ در شہر شما نیز کنند

پھر یہ نجومی ساعت کسی عربی کتبہ میں نہ ہو کر سنسکرت کتبہ میں ہے جس کا تعلق عادل شاہ کی ہندو رعایا سے تھا، چونکہ ہندو ہر اہم کام میں مبارک ساعت کا بہت زیادہ خیال رکھتے ہیں، اس لیے ممکن ہے کہ ان کی اسی دلچسپی کے پیش نظر کتبۂ مذکورہ میں مبارک ساعت درج کی گئی ہو۔

فاضل مقالہ نگار مولانا عبدالستار صاحب فاروقی کا تیسرا فقرہ یہ ہے، "مسجد کا سنگ بنیاد ایسے زمانہ میں رکھا گیا جب کہ دکن میں "ہندو لمانی" ہوا چل رہی تھی"، پروفیسر حمیدالدین سلیم نے ہندوؤں اور مسلمانوں کی مشترک زبان اردو کے لیے "ہندو لمانی" کی اصطلاح وضع کی تھی، لیکن فاروقی صاحب نے اپنے مقالہ کے فٹ نوٹ میں ہندو لمانی کو ہندو مسلم قوم کا متحدہ نام تحریر کیا ہے، اس سے واضح ہوتا ہے کہ سولہویں صدی عیسوی میں ہندو مسلم اتحاد کی جو تحریک جاری ہوئی تھی، اسے موصوف نے ہندو لمانی ہوا چلنے سے تعبیر کیا ہے، لیکن یہ ہوا تو شہنشاہ اکبر کی وجہ سے شمالی ہند میں بڑے زوروں سے چل رہی تھی نہ کہ خاندیس و دکن میں، پھر سوال یہ ہے کہ اس ہوا سے تعمیر مسجد کا کیا تعلق؟

فاروقی صاحب کا چوتھا فقرہ یہ ہے "آج تک اس قرب و جوار میں ایسے پیرزادے موجود ہیں جن سے ہر دو قوموں کو عقیدت و ارادت ہے، اور وہ اوتاروں کو مانتے ہیں"۔

اس کا جواب یہ ہے کہ برہان پور سے چار میل دور بہادر پور میں "ست پنتھی" مسلک کے ایسے پیرزادے موجود ہیں، جن سے ہندوؤں کے ایک فرقہ کو عقیدت ہے، اور وہ بھی صرف ہندوؤں کو مرید بناتے ہیں، اور انھیں یہ سمجھاتے ہیں کہ ہر قوم میں وقتاً فوقتاً خدا کا پیغام پہنچانے اور نیکی کا راستہ بتانے والے بزرگ آئے ہیں۔[1] جنھیں ہم پیغمبر کہتے ہیں، اور تم اوتار سمجھتے ہو، سب سے آخری پیغمبر حضرت محمد مصطفیٰ صلعم عرب میں تشریف لائے جن کے بارے میں تمھاری مذہبی کتابوں میں بھی پیشینگوئیاں موجود ہیں۔[2] لہٰذا یہ دور انہی کی تعلیمات پر عمل کرنے کا دور ہے، چنانچہ وہ اپنے مریدوں سے اسلام کی کئی تعلیمات پر عمل بھی کراتے ہیں، اگر ان ست پنتھی بزرگوں کا یہ طریقہ محترم فاروقی صاحب کی نظر میں قابلِ اعتراض ہے۔ تو اس سے برہان پور کے سلاطینِ فاروقیہ کا کیا تعلق، کیونکہ نماڑ گزیٹیر کی صراحت کے مطابق ست پنتھی مسلک کے سب سے پہلے مبلغ جو بہادر پور نواح برہان پور میں تشریف لائے وہ فاروقی سلطنت ختم ہونے کے پچاس سال بعد سنہ ۱۶۵۰ء میں تشریف لائے تھے۔ فاروقیوں کے سوا دو سو سالہ دورِ حکومت میں نہ یہاں ایسے پیرزادے تھے، نہ ایسی کوئی تحریک تھی

فاروقی صاحب کے اعتراضات کے تسلی بخش جوابات تحریر ہو چکے۔ اب سب سے آخر میں جناب جاوید صاحب انصاری کے مقالہ کے اس حصہ پر تبصرہ کرتا ہے، جس میں جامع

---

[1] اس عقیدہ کی بنیاد قرآن مجید کی ان آیتوں پر ہے۔ (۱) اِن من امۃٍ الا خلا فیھا نذیر۔ یعنی کوئی قوم ایسی نہیں ہے، جس میں (برے کام کے برے نتیجہ سے) ڈرانے والے نہ آئے ہوں۔ (۲) ولکلِ قومٍ ھاد۔ اور ہر قوم کے لئے ایک ہدایت کرنے والا آیا ہے۔

[2] یہ پیشینگوئیاں بھوشیہ پران (भविष्य पुराण) اور کلکی پران (कल्की पुराण) میں موجود ہیں۔

برہان پور کے کتبوں کا ذکر ہے، موصوف کا ایک قابل قدر مقالہ ماہنامہ معارف کی ماہ اپریل ۱۹۶۴ء کی اشاعت میں شائع ہوا ہے، جس کا عنوان "فن تعمیر کا ایک نادر نمونہ" اور ذیلی عنوان "جامع مسجد برہان پور" ہے۔ مقالۂ مذکورہ میں مسجد مذکور کی تعمیری شان پر تفصیل سے روشنی ڈالی گئی ہے، جو قابل تعریف ہے، مگر کتبات کا بیان تشنہ رہ گیا ہے۔ موصوف نے فاروقی دور کے دونوں کتبوں کا مختصر سا تعارف تو کرایا ہے۔ مگر نہ ان کی عبارتیں نقل کی ہیں نہ ترجمہ تحریر کیا ہے، دورِ مغلیہ کا کتبہ جو جنوبی مینار پر کندہ ہے، اس کی صرف عبارت بلا ترجمہ و تبصرہ نقل کر دی ہے، ان تینوں کتبات کے اس سرسری ذکر میں بھی کچھ فروگذاشتیں ہو گئی ہیں، جو حسبِ تفصیل ذیل ہیں۔

۱۔ دو لسانی کتبہ (عربی و سنسکرت کا مشترکہ کتبہ)

(۱) محترم مقالہ نگار نے اس کتبہ کے حصۂ عربی کا رسم الخط خطِ طغرا تحریر کیا ہے، حالانکہ وہ خط نسخ ہے۔

(۲) سنسکرت حصہ کی ابتدائی عبارت کے بارے میں تحریر کیا ہے کہ "اس میں کلام اللہ کی آیت اور حدیث کا ترجمہ ہے۔" اس سے ان کی مراد وہی آیت اور وہی حدیث ہے جکی وہ کتبہ مذکورہ کے حصۂ عربی میں نشان دہی کر چکے ہیں۔ حالانکہ نہ اسمیں نہ اس آیت کا ترجمہ ہے نہ اس حدیث کا بلکہ دربارِ الٰہی میں نذرانۂ عقیدت پیش کرتے ہوئے اوصافِ الٰہی کا ذکر ہے۔

۲۔ وسطی محراب کا کتبہ ۱۔ یہ کتبہ منبر کے پاس کی وسطی محراب پر ہے جس کا خط ثلث ہے، مگر موصوف نے اسے خط کوفی تحریر کیا ہے۔

۳۔ جنوبی مینار کا کتبہ ۱۔ (۱) محترم جاوید صاحب نے اسکی پہلی سطر میں "ظل اللہ اکبر بادشاہ غازی" تحریر کیا ہے، حالانکہ کتبہ میں "ظل اللہ اکبر بادشاہ شاہ اکبر صفات" تحریر ہے۔ پہلا اکبر اللہ کی صفت ہے اور دوسرے اکبر سے

شہنشاہ اکبر مراد ہے۔

(۲) موصوف نے اس کتبہ کی دوسری سطر کا شعر اس طرح تحریر کیا ہے۔ ؎

گشت آباد اسیر از زرانِ نامی   سنہ بشش بگفت الٰہ اباد

حالانکہ کتبہ میں ازراں کے بجائے "ازاں" اور سنہ بشش بگفت کے بجائے "سنہ بیش گفت" تحریر ہے۔ ممکن ہے کہ ازراں کتابت کی غلطی ہو مگر دوسرے مصرع کی غلط تحریر میں معارف کے کاتب کا کوئی دخل نہیں ہے۔ کیونکہ مقالہ نگار نے ہے جس کتاب سے نقل کیا ہے اس میں یہ اسی طرح درج ہے۔

(۳) اس کتبہ میں تیسری سطر کے ابتدائی الفاظ یہ ہیں "بتاریخ ۱۲ فروردین ماہ الٰہی سنہ ۴۵ موافق رمضان سنہ ۱۰۰۹" مگر موصوف کے مقالہ میں "۱۲ فروردین" کے بجائے "۱۱ فروردین" اور "رمضان سنہ ۱۰۰۹" کے بجائے "۵ رمضان سنہ ۱۰۰۹ھ" تحریر ہے، کاتب کتبہ میں رمضان کی تاریخ جو ۲۴ تھی درج کرنا بھول گیا، اس لیے کتبہ کی نقل میں لفظ رمضان سے پہلے ۵ کے ہندسہ کا کوئی جواز نہیں ہے۔

(۴) موصوف نے ساتویں سطر میں "والمنتسب اناالی سید شیر قلندر ابن بابا حسین ابدال" تحریر کیا ہے جبکہ کتبہ میں 'انا' کے بجائے 'امّاً' اور حسین ابدال کے بجائے حسن ابدال موجود ہے۔ بابا حسن ابدال ایک مشہور بزرگ تھے ان ہی کے نام پر وہ بستی بھی حسن ابدال کہلاتی ہے جس میں ان کا مقبرہ ہے، کاتب نے والمنتسب امّاً کے الفاظ سے اپنے مادری سلسلۂ نسب کا ان سے انتساب کیا ہے۔

(۵) کتبہ کی نویں سطر میں "فتح خاندیس" درج ہے، مگر مقالۂ مذکورہ میں فتح خاندیش تحریر ہے۔

جنوبی مینار کے کتبہ کی عبارت نقل کرنے میں موصوف سے جو فروگذاشتیں ہوئی ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ انھوں نے کوثر پرنٹنگ مطبوعہ تاریخ برہانپور سے عبارت مذکورہ نقل کر لی، اور اسے کتبۂ مینار کی اصل عبارت سے نہیں ملایا۔

ادبیات

قطعات

از۔ جناب خسروی صاحب، ناظم آباد کراچی

۱۔ بے پردہ رخِ حیات کبتک ہوگا؟
عرفانِ کمالِ ذات، کبتک ہوگا؟
انسان بنے گا اپنے لائق کبتک؟
شائستۂ کائنات، کبتک ہوگا؟

۲۔ ہر ایک رند یہاں غرق اپنے جام میں ہے
ہر ایک جام ابھی گردشِ مدام میں ہے
وہ مے فروش، کہ میخانہ جس سے رقص میں ہے
کشیدِ تازہ کے ہر آن اہتمام میں ہے

۳۔ تسلیم کہ بے سوز دروں آج ہیں سینے
جینے کے نہ آتے ہیں، نہ مرنے کے قرینے
ملت کے خرابے سے نہ جا روحِ محمدؐ
شاید تجھے مل جائیں کہیں اب بھی دفینے

۴۔ اے کہ مستقبل کا کرنا ہے تجھے ہر دم سفر
دولتِ ماضی سے کیسہ حال کا خالی نہ کر
اے مسافر نفس و آفاق کے رک رک کے چل
سوئے یثرب ڈال تارہ پیچھے مڑ مڑ کر نظر

۵۔ گرچہ شعلے کچھ فروزاں اب ان کے دل میں ہیں
بجلیاں پنہاں ابھی گو ان کے آب و گل میں ہیں
راہ کعبہ پوچھتے ہیں دیر والوں سے مگر
اے محمدؐ، راہرو تیرے یہ کس منزل میں ہیں؟

۶۔ انفس و آفاق میں کرتا رہا قرنوں سفر
مل نہ پائی یک نفس بھی تو کہیں جائے حضر
دیکھ ڈالے عرش و کرسی کے مقاماتِ جلیل
کوئی بھی اپنے سوا پایا نہ اپنا مستقر

۷۔ کیوں لئے بیٹھا ہے یہ پشتارۂ علم و عمل؟
تو "لعمرک"[۱] کا ہے مسافر، وادیٔ "لا" سے نکل

---

(۱) انہم لفی سکرتہم یعمہون (القرآن)

بوجھ سے اپنے ہی گر جانے تو اس راہ میں — اگلی منزل تک پہنچنا ہے تو ہلکا ہو کے چل

۸۔ وادیٔ گیسو میں کیوں سالک رُخِ زیبا کے ہیں؟ — دشتِ ”لا“ میں کیوں ابھی تک قافلے ”الّا“ کے ہیں؟

صبحِ انساں کوہِ حرا سے ہو چکی کب کی طلوع — کس خرابے میں پڑے رہرو ابھی بطحا کے ہیں؟

غزل

از جناب رضا ابن فیضی

سنگ ریزوں میں ہیں یا آب گینوں میں ہیں — ہم رہیں جیسوں میں بھی اپنے قرینوں میں ہیں

کم سے کم اس دور میں اتنا ہنر بھی ہے بہت — بے ہنر ہیں جو وہ میرے نکتہ چینوں میں ہیں

خاک ہو کر بھی بچا لے جاؤ تم اپنا انا — قشقہ ہو جاؤ مگر تیور جبینوں میں ہیں

اب یہ بیٹھے سوچتے ہیں قشقہ کھا جانے کے بعد — ہم بھی خنجر بن کے کچھ دن آستینوں میں ہیں

پاؤں کی زنجیر ٹھہری وسعتِ قلب و نظر — ورنہ ہم سے لوگ کیا کوتاہ بینوں میں ہیں

زندگی بے لذتِ آشوب تو کچھ بھی نہیں — موج تو دریا میں ہے ہم کیا سفینوں میں ہیں

جلتی شمعوں کا مقدر اور کیا اس کے سوا — سرد راتوں میں بھی یہ ڈوبی پسینوں میں ہیں

پوچھتی ہے آج مجھ سے مرے دل کی دھڑکنیں — ہم لبوں سے پھوٹ نکلیں یا کہ سینوں میں ہیں

ہم اگیں گے جب تو فصلِ ہنر کاٹیں گے لوگ — آؤ! تخمِ آگہی بن کر زمینوں میں ہیں

آنچ دیں عصری روّیے تو چٹخ جائیں فضا
اس ادا سے کیا سخن کے نازنینوں میں ہیں

مطبوعاتِ جدیدہ

ماذا خسر العالم بانحطاط المسلمین - از مولانا سید ابوالحسن علی ندوی، تقطیع متوسط، کاغذ عمدہ، طباعت خوبصورت ٹائپ، صفحات ۳۲۴ قیمت تحریر نہیں۔ پتہ ؟

اس مفید مشہور اور مقبول کتاب کو خود فاضل مصنف نے عربی اور اردو دونوں زبانوں میں لکھا تھا، یہ عربی کا دسواں ایڈیشن ہے، اس کے اردو اور انگریزی کے بھی متعدد ایڈیشن چھپے ہیں، اور فارسی و ترکی میں بھی ترجمے ہو چکے ہیں، معارف میں پہلی دفعہ عربی ایڈیشن تبصرے کے لیے آیا ہے، اس میں فاضل مصنف نے یہ دکھایا ہے کہ اسلام سے پہلے جب خدا پرستی کی تعلیم مفقود اور جاہلیت کا گھٹا ٹوپ اندھیرا چھایا ہوا تھا تو دنیا کی تمام قوموں اور ملکوں کی مذہبی، اخلاقی، سیاسی، معاشی، تمدنی اور معاشرتی حالت نہایت ابتر تھی لیکن اسلام نے لوگوں کے افکار و اعمال میں عظیم الشان انقلاب برپا کر دیا، خود فراموشی کو خدا پرستی میں تبدیل کر دیا، اور جاہلیت کی تمام خرابیوں کی اصلاح کر کے ایک ایسی امت پیدا کر دی جو نہایت برگزیدہ اور انسانیت کے لیے نمونۂ عمل تھی، لیکن جب اس کا زوال و انحطاط شروع ہوا تو قوموں کی قیادت و امامت اس کے ہاتھوں سے نکل کر ان مغربی قوموں کے ہاتھوں میں آگئی، جن کا نقطۂ نظر تمام تر مادی، نفس پرستی اور خدا بیزاری تھا، اس کے نتیجہ میں پھر وہی پرانی جاہلیت عود کر آئی جس کو اسلام نے بیخ و بن سے ختم کر دیا تھا، مصنف کا خیال ہے کہ یہ نئی جاہلیت علم و تہذیب کے جامہ میں ملبوس اور خوشنما الفاظ اور

نمائشی اصطلاحات کا سہارا لئے ہوئے ہے، اس لئے اس کی تباہی اور نقصانات پرانی جاہلیت سے بھی زیادہ خطرناک ہیں، اس طرح امت مرحومہ کے زوال سے پوری دنیا اور ساری انسانیت اس خیر و برکت سے محروم ہوگئی، جو اسلام لیکر آیا تھا، ع

زوال مرد مومن سے زوال عالم خاکی۔ فاضل مصنف کے نزدیک موجودہ جاہلیت کی لائی ہوئی مشکلات کا واحد حل یہ ہے کہ دنیا کی قیادت مادہ پرست اور خدا بیزار لوگوں کے بجائے خداشناس اور خدا ترس لوگوں کے ہاتھوں میں آجائے، مگر یہ اسی وقت ممکن ہے، جب مسلمانوں کے اندر اپنی اس مجرمانہ کوتاہی کی تلافی کا جذبہ پیدا ہو جو انھوں نے انسانیت کے حق میں کی ہے، اور خود دنیا کو بھی اپنی اس بدقسمتی کا احساس ہو جائے، جس سے اس کو مسلمانوں کی قیادت سے محروم ہو جانے کی بنا پر دوچار ہونا پڑا ہے، چنانچہ وہ مسلمانوں اور اسلامی ملکوں کو عموماً اور عالم عرب کو خصوصاً خدا پرستی، اسلامی تعلیمات اور اخلاق حسنہ سے آراستہ ہو کر دنیا کی اصلاح و قیادت کے لیے کمربستہ ہونے کا پیام دیتے ہیں، ؎

عالم ہمہ ویرانہ ز چنگیزی افرنگ معمار حرم! باز بہ تعمیر جہاں خیز

یہ کتاب کے اُن مباحث کا مختصر خاکہ ہے، جو اس کے پانچ مبسوط ابواب میں نہایت اخلاص و دردمندی بڑی جامعیت و تحقیق، مکمل تجزیہ استدلال اور پورے جوش بیان کے ساتھ سلیس و شگفتہ زبان اور دلآویز و موثر پیرایے میں قلمبند کئے گئے ہیں، شروع میں مصر کے نامور فضلا ڈاکٹر محمد یوسف موسیٰ، سید قطب اور شیخ احمد الشرباصی کے مقدمے ہیں، ان میں کتاب کی خوبیاں اور خصوصیات اور مصنف کے مختصر حالات اور علمی و تصنیفی اور دینی و ملی کارنامے بیان کئے گئے ہیں،

یادیارِ مہرباں۔ از جناب ڈاکٹر خواجہ احمد صاحب فاروقی، تقطیع متوسط کاغذ کتابت عمدہ، صفحات ۱۳۸ قیمت لعہ، پتہ۔ گلستاں پبلشنگ ہاؤس دہلی ۶

اردو کے ممتاز ادیب و انشا پرداز ڈاکٹر خواجہ احمد فاروقی نے اس مختصر کتاب میں ملک و ملت کے مندرجہ ذیل گیارہ مشاہیر علم و تعلیم اور ناموران ادب و سیاست کا سوانحی خاکہ تیار کیا ہے، سر تیج بہادر سپرو، آصف علی، مرد آزاد (مولانا آزاد) صدیقی مرحوم (صدیق احمد علیگ) مولوی عبدالحق، پنڈت جواہر لال نہرو، مولانا حامد حسن قادری، ذاکر صاحب، سیدین صاحب، راجہ جی اور ڈاکٹر تاراچند فاضل مصنف نے اپنے مخصوص اور دلپذیر انداز بیان میں ان اکابر کی سیرت و شخصیت اور خدمات و کمالات کا نہایت پُرکیف اور دلکش مرقع پیش کیا ہے، یہ مضامین پہلے مختلف رسالوں میں چھپے تھے، اب ان کو کتابی صورت میں بڑی نفاست و اہتمام سے شائع کیا گیا ہے، ہر مضمون میں رعنائی خیال کے ساتھ رنگینی بیان، اور حسن ادا بھی ہے، عبارت، اشارت اور کنایت کا ماہرانہ انداز بھی، خواجہ صاحب کے قلم کی خوبی سے یہ سوانحی خاکے ادب و انشا کا گلدستہ بن گئے ہیں۔

نذیر احمد شخصیت اور کارنامے۔ مرتبہ ڈاکٹر اشفاق احمد اعظمی صاحب، متوسط تقطیع، کاغذ کتابت و طباعت اچھی، صفحات ۱۴۴ مجلد مع گردپوش قیمت ۲۵ عہ پتہ انجمن ترقی اردو ہند، دہلی۔

زیر نظر کتاب وہ تحقیقی مقالہ ہے، جس پر ڈاکٹر اشفاق احمد اعظمی لکچرر شعبۂ اردو شبلی ڈگری کالج اعظم گڑھ کو گورکھپور یونیورسٹی نے پی۔ ایچ۔ ڈی کی ڈگری دی تھی، اس میں ڈپٹی نذیر احمد کے حالات و کمالات کا مفصل جائزہ لیا گیا ہے، یہ چھ ابواب کا مجموعہ ہے،

شروع کے دو ابواب میں نذیر احمد کے حالات اور شخصیت کا خاکہ پیش کیا گیا ہے، ان کی شخصیت پر دلی کالج اور علی گڑھ تحریک کا بھی اثر تھا، اس لیے ان اداروں کی سرگذشت بھی بیان کی گئی ہے، اور اسی ضمن میں اردو نثر کی مختصر تاریخ بھی تحریر کی گئی ہے، تیسرے باب میں اردو میں قصہ گوئی کا جائزہ لیکر ناول کے اجزائے ترکیبی اور نذیر احمد کی ناول نگاری کا پس منظر بیان کیا گیا ہے، چوتھے اور پانچویں باب میں ان کے ناولوں پر مفصل تبصرے کر کے ناول نگاری میں ان کا درجہ متعین کیا گیا ہے، آخری باب میں ان کتابوں کا جائزہ لیا گیا ہے، جو انھوں نے انگریزی اور عربی سے اردو میں ترجمہ کیں، اسی حصہ میں مذہبی کتابوں پر بھی تبصرہ ہے، آخر میں ان کے اسلوب تحریر اور زبان و بیان کے محاسن تحریر کئے گئے ہیں۔ مصنف نے بعض نقادوں کی رایوں سے کہیں کہیں اختلاف کیا ہے جن سے توازن کا اظہار ہوتا ہے، نذیر احمد کی کتابوں پر ان کے تبصرے بھی بڑی حد تک معتدل ہیں، لیکن امہات الامہ کی خامیوں کو صرف زبان و بیان ہی تک محدود کرنا اور اسکو جدید مذہبی تحقیق کی بنیاد قرار دینا (ص ۱۱) مذہبی معلومات کی کمی کا نتیجہ ہے، بعض مباحث جیسے قصہ گوئی کا ارتقا، ناول نگاری اور علی گڑھ تحریک کے پس منظر اور تصنیفات پر تبصروں کی تمہید میں غیر ضروری طوالت سے کام لیا گیا ہے، غیر معروف ناموں جیسے عبد الخالق و عبد القادر (ص ۳۰) اور حاجی امداد العلی (ص ۸۴) پر مختصر تشریحی حواشی لکھنے کی ضرورت تھی، کہیں کہیں طرز ادا اور طریقۂ تعبیر میں بھی خامی پائی جاتی ہے، سید احمد شہید بریلوی کے متعلق "ہیجانی کیفیت" (ص ۴۰) سر سید احمد خان مرحوم کے بارہ میں "بے ہنگم پن" (ص ۵۰) منشی ذکاء اللہ مرحوم کے لیے "صفحات کالے کئے" (ص ۰) ڈاکٹر احسن فاروقی کے بارہ میں "اپنا مطلب تو سیدھا کر لیا" (ص ۱۰۰) اور مذہبی حلقوں کی تحقیر کے لیے "کٹھ ملاؤں" اور ملائیت" وغیرہ کی پھبتی

شائستگیٔ تحریر کے خلاف ہے، دست دگریباں کو غلطی سے دست دگریباں (ص ۹۴) پیش پا افتادہ کو پیش افتادہ (ص ۹۰) طلاق و خلع کو طلاق و خلا (ص ۲۶۰) ماخوذ ہیں کو ماخوذ کی گئیں (ص ۲۹۶) اور شمس الائمہ سرخسی کو سرحسن (ص ۳۳۱) لکھا گیا ہے، یہ مصنف کی ابھی پہلی تصنیف ہے، اسلئے اس طرح کی فروگذاشتوں کا رہ جانا قابل تعجب نہیں، ان فروگذاشتوں سے قطع نظر یہ کتاب محنت سے لکھی گئی ہے، جس کا اندازہ کتابیات کی طویل فہرست سے بھی ہوتا ہے۔ ڈپٹی نذیر احمد کے کارنامے اظہر من الشمس ہیں، وہ ان اساطین خمسہ میں ایک تھے جنھوں نے اردو نثر کا معیار بلند کرنے میں اہم حصہ لیا ہے، اس لیے ان پر ایک تحقیقی مقالہ لکھنے کی ضرورت تھی، مصنف نے یہ کتاب لکھکر اس ضرورت کو پورا کرنے کی کوشش کی ہے۔

جرس کارواں ۔ از۔ جناب عمر انصاری صاحب، تقطیع خورد، کاغذ کتابت و طباعت بہتر صفحات ۶۴ مجلد مع رنگین گرد پوش، قیمت عہ؍ پیسے ناشر مکتبہ فردوس ادب ۲۰۰ امین آباد (پارک لکھنؤ)

جناب عمر انصاری ممتاز پختہ مشق شاعر ہیں، یہ انکی نظموں کا ایک مختصر مجموعہ ہے، اس میں وطن کی عظمت و شوکت کا نغمہ اور اتحاد و یکجہتی کا درس بھی ہے، فرقہ آرائی، طبقہ داریت تفریق و امتیاز اور ذات پات وغیرہ کی مذمت بھی ہے، ایک نظم میں اردو کی گذشتہ شاندار تاریخ اور موجودہ دور میں اسکی مظلومیت بیان کی گئی ہے، اور دوسری میں گاندھی جی کے ایثار و قربانی کا ذکر ہے، اس مجموعہ کی زیادہ موثر اور کامیاب نظم "دہر آشوب" ہے، جو دراصل موجودہ دور کی ذہنی، اخلاقی اور تہذیبی پستی کا نوحہ ہے، یہ مجموعہ مصنف کی قادر الکلامی کے علاوہ ان کی قوم پروری اور حب الوطنی کا نمونہ بھی ہے،

شیخ احمد عبد الحق ردولوی؟ مرتبہ۔ جناب شاہ مبین احمد صاحب

منظر فاروقی، متوسط، کاغذ کتابت وطباعت اچھی صفحات ۲۰۰، قیمت عہ
مصنف سے قصبہ رودلی، ضلع بارہ بنکی سے ملے گی۔

حضرت مخدوم احمد عبدالحق ردولوی آٹھویں اور نویں صدی ہجری میں سلسلۂ چشتیہ صابریہ کے مشہور بزرگ گذرے ہیں۔ ان کا ذکر تذکروں میں ملتا تو ہے، مگر اس سے تفصیلی معلومات حاصل نہیں ہوتی ہیں، اس لیے ابھی تک ان کی کوئی مبسوط سوانح عمری نہیں لکھی گئی ہے، زیر نظر کتاب میں ان کے حالات وکمالات، سیرت واخلاق، سیر وسیاحت، طریقۂ رشد واصلاح کے علاوہ بعض ممتاز خلفا اور ان کے سلسلہ کے کئی نامور بزرگوں کا مختصر تذکرہ ہے، خانقاہ اور عرس کی مروجہ رسموں اور طریقت وخاندان کے شجرے بھی تحریر کئے گئے ہیں، آخر میں مخدوم صاحب کے خاندان کے موجودہ صدی کے بعض نامور اشخاص کا مختصر حال دیا گیا ہے، مصنف اسی خانوادہ کے چشم وچراغ ہیں اس لئے اس میں عقیدت مندانہ رنگ زیادہ نمایاں ہو گیا ہے گو اس کتاب کے سب واقعات کو مستند نہیں کہا جا سکتا، تاہم مخدوم صاحب اور ان کے سلسلۂ چشتیہ صابریہ کے بارہ میں جو مفید معلومات تحریر کئے گئے ہیں، ان سے آئندہ سوانح نگار کو مستند اور غیر مستند باتوں کی چھان بین میں مدد مل سکتی ہے۔

آئینے کے سامنے:- مرتبہ- جناب بشر علی صدیقی صاحب تقطیع خورد، کاغذ کتابت وطباعت معمولی صفحات ۱۱۰، قیمت للعہ پتہ بشر علی صدیقی۔ گلی وحید بخش محلہ سوتھہ بدایوں۔

جناب بشر علی صدیقی کے پندرہ (۱۵) ہلکے پھلکے ادبی وتنقیدی مضامین کا یہ مجموعہ تین حصوں پر مشتمل ہے پہلے حصہ میں سرسید احمد اور ان کے ہمعصر دوسرے نامور مصنفین مولانا شبلی، ڈپٹی نذیر احمد، مولانا حالی اور عبدالحلیم شرر کے ادبی پہلوؤں پر چھوٹے چھوٹے مضامین ہیں، اسی حصہ میں اقبال کے فلسفہ وشاعری کے متعلق ایک دلچسپ مکالمہ بھی ہے، دوسرے حصہ میں مصنف نے اپنے وطن بدایوں کے بعض شاعروں اور وہاں کے نظامی پریس سے شائع ہونے والے دیوان غالب کے مختلف ایڈیشنوں کی خصوصیات تحریر کی ہیں، تیسرے حصہ میں بعض نئی ادبی کتابوں پر ریویو ہے مصنف کی تحریر میں متانت اور خیالات میں توازن ہے اور یہ مضامین طلبہ کے استفادہ کے لائق ہیں۔　　"ض"

جلد ۱۱۶　ماہ ستمبر ۱۹۷۵ء مطابق ماہ رمضان المبارک ۱۳۹۵ھ　عدد ۳

مضامین

مقالات

بَابُ التَّقْرِيْظِ وَالْاِنْتِقَادْ